ISSN : 2582-1229

بین الاقوامی پیر ریویو، ریفریڈ جرنل

(سہ ماہی)

تاریخِ ادبِ اردو

جلد۔۲ شمارہ۔۴

سرپرستِ اعلیٰ: ارتضیٰ کریم

مدیر: ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا

سہ ماہی دہلی

تاریخِ ادبِ اردو

جلد :۲ (اردو ادب کا نقیب اور ترجمان) **شمارہ**:۴

اکتوبر تا دسمبر ۲۰۲۰.

سرپرست اعلیٰ:
ارتضیٰ کریم

مدیر: ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا

مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر محمد بہلول

سرپرست: ڈاکٹر راکیش کمار پانڈے، پروفیسر رئیس انور رحمٰن، پروفیسر کوثر مظہری، پروفیسر محمد رضی الرحمٰن، ڈاکٹر پرمود کمار بھارتی

مجلس مشاورت :

بیرون ملک : پروفیسر یوسف خشک (پاکستان)، پروفیسر ضیا حسن (پاکستان)، پروفیسر حلیل طوقار، (ترکی) ڈاکٹر محمد سلمان بھٹی (پاکستان)، پروفیسر احمد القاضی (مصر) ڈاکٹر سمیرا بشیر (پاکستان)، پروفیسر ثمینہ گُل (پاکستان)، پروفیسر اسومان اوذکین (ترکی)، پروفیسر دُرمُش بُلگر (ترکی)، فرزانہ اعظم لطفی (ایران)، ڈاکٹر اعجاز رحمت علی (ماریشس)، پروفیسر ابراہیم محمد ابراہیم السعید (مصر)، ڈاکٹر علی بیات (ایران)، ڈاکٹر محمد کیومُرسی (ایران)، ڈاکٹر ذکائیکارداس (ترکی)، ڈاکٹر عبدالمجید حبیب اللہ (مصر)، پروفیسر منور ہاشمی (پاکستان)، پروفیسر نذر عابد (پاکستان)، ڈاکٹر ایمانشکری طحٰا (مصر)، فاطمہ عمر عبداللہ محمو (مصر) والاسید عبدالستار السید (مصر)، وفایزدان منیش (تہران)، ڈاکٹر تغرید محمد البیومی (مصر)

اندرون ملک : ڈاکٹر خالد اشرف، ڈاکٹر نوشاد مومن، ڈاکٹر دانش الہ آبادی، پروفیسر حبیب نثار، پروفیسر محمد آفتاب اشرف، پروفیسر آلِ ظفر، ڈاکٹر افسر کاظمی، ڈاکٹر مجیب احمد خان، ڈاکٹر نصرت جہاں، ڈاکٹر مشتاق عالم قادری، ڈاکٹر قمر صدیقی، ڈاکٹر عبداللہ امتیاز احمد، ڈاکٹر محمد داود محسن، رضوان ندوی، ہاجرہ نور احمد زریاب، ڈاکٹر متھن کمار، ڈاکٹر رحمٰن اختر، ڈاکٹر بلرام شکلا، ڈاکٹر شاہد رزمی، جناب پریم ناتھ بسمل، ڈاکٹر فرخندہ زمیر،

معاونین: فاطمہ خاتون، انعم ستار، ڈاکٹر شبیر عالم، روحی سلطانہ، ڈاکٹر محمد التمش، ڈاکٹر جابر حمزہ، عریشہ تسنیم، شائستہ مہ جبیں، انا حمیدی، (ایران) محمد نسیم، علما قریشی (ورجینیا)،

قانونی مشیر: ایڈوکیٹ انل کمار سنگھ، ایڈوکیٹ سیما سنگھ

ازتعاون

فی شمارہ	اس شمارے کی قیمت	سالانہ	خصوصی
25	200	1000	5000

رابطہ سہ ماہی ''تاریخِ ادب اردو''

2496,2nd Floor, Punjabi Basti, Subzi Mandi, Ghanta Ghar
Delhi-07
Email : taudelhi@yahoo.com,
A/c Name: PEACE INDIA FOUNDATION
A/c No: 51521131001918
IFSC: PUNB0105152
Mobile No. : +91-9968244001

مالک، طابع و ناشر ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا نے J.K Offset Printing press, سے چھپوا کر دفتر ''تاریخِ ادب اردو'' 2496nd Floor,Punjabi Basti, Subzi Mandi,Ghanta Ghar Delhi-7 سے شائع کیا۔

''تاریخِ ادب اردو'' کی مشمولات سے مدیر/وابستگان کا متفق ہونا لازمی نہیں۔ ''تاریخِ ادب اردو'' سے متعلق کسی بھی تنازعہ کا حقِ سماعت صرف دہلی کی عدالت میں ہوگا۔

مشمولات

اداریہ

مضامین:

1۔ ناصر ملک کے شعری امتیازات	ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا	7
2۔ تہذیبِ غزل کے دو شاعر فراق اور فیض...	بنٹی فرید علی سید	17
3۔ مختار ٹونکی: راجستھان کے اہم افسانہ نگار	سلطانہ فاطمہ انصاری	25
4۔ منٹو کی کامیاب فلمی زندگی کا سفر	ڈاکٹر محمد نظام الدین	35
5۔ تصور روایت محمد حسن عسکری کی نظر میں	ڈاکٹر شمیم اختر	39
6۔ مہاتما گاندھی: تعلیمی، مذہبی..	ڈاکٹر شیریں فاطمہ	49
7۔افتخار امام نے نہ صرف ادیب...	ڈاکٹر سیفی سرونجی	63
8۔آزادی سے قبل اجمیر میں اردو افسانہ	چھوٹو لال	67
9۔جموں وکشمیر کی شاعرات وادباء...	ڈاکٹر حارث حمزہ لون	77
10۔منتخب غزلیں		92

اداریہ:

اردو ایک عالمی اور مقبول ترین زبان ہے۔ مختصر عرصہ میں لوگوں کے دل و دماغ میں پیوست ہونے والی اولین زبان ہے۔ اردو زبان کی حلاوت اور شیرینی کے سبب سب اس کے گرویدہ ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود یک اہم مسئلہ اردو کے مقاصد کے تعین کا ہے۔ عام طور پر کسی زبان کو پڑھانے کے چار مقاصد ہیں: سننا، بولنا، پڑھنا اور لکھنا۔ ایک مضمون کی حیثیت سے نثر، نظم، انشا اور قواعد کے الگ الگ مقاصد ہوتے ہیں اور ہر مقصد کے عمومی اور خصوصی مقاصد ہوتے ہیں جیسے نثر کی تدریس کے دو مقاصد افہامِ مطالب اور اظہار مافی الضمیر ہیں۔ نظم کے تین مقاصد ہیں جن میں افہامِ مطالب، اظہار مافی الضمیر اور استحسان ہیں۔ انشا کے مقاصد بھی تین ہیں جن میں افہامِ مطالب، اظہار مافی الضمیر اور اطلاق ہیں۔

اُردو زبان کی تدریس میں ہم اپنی زبان کو نہ جانے کیوں ایک اجنبی زبان کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ زبانوں کے رسم الخط الگ ضرور ہیں لیکن ان کی بنیادی باتیں الگ نہیں ہوسکتیں۔ جب ہم اسکولوں اور کالجوں میں اردو اساتذہ کو پڑھاتا ہوا دیکھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اُردو زبان، زبان نہیں صرف ایک مضمون ہے۔ اِس ترقی یافتہ دور میں بھی جماعت میں صرف لیکچر دے کر اور چند عبارتیں لکھوا کر کام نہیں چلایا جاسکتا۔

سب سے پہلا مسئلہ طریقۂ تدریس کا ہے۔ عام طور سے ہم اپنے طلبہ کو طریقۂ تدریس کے بارے میں بتاتے ہیں کہ پہلے تمہید باندھی جائے یعنی کسی بھی سبق، موضوع یا عنوان کو براہِ راست نہ بتا کر طلبہ کی سابقہ معلومات پر مبنی سوالات و جوابات کی بنا پر سبق کا موضوع یا عنوان بتایا جائے۔ اس کے پیچھے یہ فکر کارفرما ہے کہ طلبہ کو تدریس کیلئے ذہنی طور پر تیار کیا جائے تاکہ وہ پڑھائے جانے والے سبق میں خاطر خواہ دلچسپی لیں۔ اعلانِ سبق کے بعد موزوں آواز، صحیح تلفظ اور درست لب ولہجہ کے ساتھ سبق کی بلند خوانی کی جائے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ استاد کی بلند خوانی ایسی ہو کہ سبق کا مفہوم خود بہ خود واضح ہو جائے۔ ظاہر سی بات ہے بلند خوانی کے ذریعے مفہوم کو واضح کرنے میں استاد کو اپنی تمام تر قوتوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لانا پڑے گا۔

اس کے بعد ایک اہم مسئلہ عبارت کی تفہیم کا آتا ہے جس میں جملوں یا عبارت کے پیچھے چھپے ہوئے مفہوم کو واضح کرنا ہوتا ہے اور طلبہ کے ذہن کو جھنجھوڑنا ہوتا ہے۔ الفاظ کے معنی اخذ کرائے جاتے ہیں تاکہ طالب علم ایک لفظ کے ایک سے زائد استعمالات سے روشناس ہو سکے۔ جامعات اور کالجوں میں بھی زبان کے ترسیلی رول کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ وہاں زبان صرف ادب بن کر رہ جاتی ہے۔ کسی بھی جریدے میں اگر کوئی مضمون غالب، اقبال، میر، پریم چند وغیرہ سے ہٹ کر ہوتا ہے تو اس پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی۔ جامعات اور کالجوں میں عام طور سے لیکچر اور

بحث ومباحثہ (وہ بھی بہت کم) پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ جب یہی طلبہ بی ایڈ یا ڈی ایڈ کرنے آتے ہیں اور ان کو تدریس کے مختلف طریقوں سے روشناس کرایا جاتا ہے تو وہ ہکا بکا رہ جاتے ہیں کہ اب تک تو ہم نے ایسا نہیں کیا تھا۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ جب ہماری درسی کتابوں ہی میں مقاصد کی یہ درجہ بندی نہیں ہے اور مقاصد کا پیش نگاہ رکھنا کیوں ضروری ہیں اس کا بیان نہیں ہے تو اس صورت میں طالب علم کس طرح صحیح علم حاصل کریگا اور جب صحیح علم حاصل نہیں ہوگا تو وہ پڑھائے گا کیسے؟ یہاں ضرورت ہے کہ اُردو تدریس کی بنیادی باتوں کو واضح کیا جائے۔

یہ دریافت کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نمونے کا سبق ایک طالب علم کیلئے تیار کیا جا رہا ہے یا پوری جماعت کیلئے۔ نفسیاتی اُصول یہ ہے کہ نمونے کا سبق فردِ واحد کو ذہن میں رکھ کر تیار کیا جانا چاہئے کیونکہ ہر طالب علم اپنی انفرادیت لے کر جماعت میں آتا ہے۔ نمونے کا سبق تیار کرتے وقت یا پڑھاتے وقت اس نفسیاتی اصول کو سامنے رکھنا چاہئے کہ جماعت میں بیٹھا ہوا ہر طالب علم دوسرے سے الگ ہے۔ ہمیں اردو کی کتابوں میں کہیں بھی طالب علم کا لفظ نہیں ملتا بلکہ 'طلبہ' ملتا ہے۔ کتابوں میں فردِ واحد نہ ہونے کی وجہ سے بھرم پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ نمونے کا سبق تیار کرتے وقت طلبہ کی جگہ طالب علم لکھا جائے تا کہ ہر طالب علم کو توجہ کا مرکز بنایا جا سکے۔

ہمارے طلبہ کے ساتھ ایک اور مسئلہ تلفظ کا ہے۔ سند یافتہ ایم اے کا تلفظ بھی اتنا خراب ہوتا ہے کہ رونا آتا ہے۔ تلفظ کون درست کرائے؟ بی ایڈ، ڈی ایڈ، جامعات یا اسکول کے اساتذہ؟ طالب علم کا تلفظ درست کرنے کا عمل اسکول میں داخلہ لیتے ہی شروع ہو جاتا ہے اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تلفظ کی بنیادی ذمے داری ان اساتذہ کی ہے جو اسکول میں اُردو زبان دانی پڑھاتے ہیں۔

ہماری پریشانی یہ ہے کہ اردو میں کوئی جامع تکنیک نہیں ہے جس کی بنیاد پر طریقۂ تدریس کے اصولوں کو واضح کیا جا سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاید ہم اردو کو دوسری زبانوں کی طرح ترسیل کی زبان نہیں سمجھتے جبکہ زبان کی حیثیت سے ہر زبان کے بنیادی اصول ایک جیسے ہیں۔ دوسری پریشانی یہ ہے کہ ہم نے اُردو کو خالص ادبی زبان بنا دیا ہے۔ ہمیں اردو کی ادبی حیثیت کے ساتھ ساتھ اس کی ترسیل کے رول کو بھی اہمیت دینی ہوگی تب ہی ہم اردو (تدریس) کے ساتھ انصاف کر سکتے ہیں۔

آپ حضرات کے نیک اور مفید مشورے بذریعہ ای میل موصول ہوئے۔ اس کے لیے آپ حضرات کا بے حد شکریہ۔ یہ تازہ شمارہ بھی آپ حضرات کے روبرو پیش ہے۔ اس سلسلے میں بھی آپ حضرات کے نیک مشوروں کا انتظار رہے گا۔

مدیر

ناصر ملک کے شعری امتیازات

ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا
شعبہ اردو، کروڑی مل کالج،
یونیورسٹی آف دہلی

ملخص

ناصر ملک ایک ایسے سدا بہار شاعر ہیں جو اپنے مرتبہ ومقام، علمی حیثیت، جذبۂ انسانی خدمت، منکسر المزاجی، مہمان نوازی، ایثار وقربانی اور اردو واہل اردو سے بے لوث محبت کی وجہ سے مشہور ومعروف ہیں۔ ناصر ملک کی شعری اور نثری تخلیقات پر مبنی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جو آن لائن بھی ان کے ویب سائٹ پر دستیاب ہیں۔ وہ ایک مستند علمی شخصیت اور معتبر ادیب ہیں۔ ان کا مشاہدہ اور مطالعہ بہت وسیع ہے۔ الغرض ناصر ملک کی شخصیت ہر اعتبار سے قابل تقلید ہے۔

'ہتھیلی' جو کہ ناصر ملک کا شعری مجموعہ ہے اس میں حمد ونعت، غزلیں، نظمیں اور آزاد نظمیں شامل ہیں۔ ناصر ملک نے اس مجموعہ میں تمام شعری وفنی تقاضوں کو برتتے ہوئے مختلف موضوعات مثلاً انسانی جذبات واحساسات کی ترجمانی اور قومی ملی کے مسائل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ بعض نظموں میں زندگی کے تلخ تجربات کو بیان کیا ہے۔ یا اس شعری مجموعہ کے ذریعہ بالخصوص مجموعے کے آخر میں پنجاب وسندھ میں 2010 میں آئے سیلاب میں ہونے والی تباہی وبربادی سے متعلق تخلیقات پیش کی ہیں۔ ناصر ملک کا شعری سفر اس مجموعہ میں پختہ اور حساس نظر آتا ہے۔ ان کا انداز ہ پیش کش، موضوعات اور مسائل زندگی کے مطالعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔

ناصر ملک کی شاعری کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ بخوبی لگا یا جا سکتا ہے کہ انہیں انسانیت سے ہمدردی اور ظلم سے نفرت وبغاوت ہے۔ وہ اپنی بات بے باکی سے کہہ دیتے ہیں

۔ان کی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جب بھی سماجی وملی یا قومی مسائل کی طرف توجہ دلاتے ہیں ان کا شعری آہنگ کبھی متاثر نہیں ہوتا اور یہ ہنر ایک عظیم شاعر وفنکار کی عظمت کی دلیل ہے۔

☆☆☆

بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن سے باتیں کر کے یا پھر جن کا ذکر خیر سن کر روحانی مسرت اور اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے۔ایسی شخصیت اہل تصوف کے یہاں پیرومرشد کی ہوسکتی ہے۔اہل اسلام بالخصوص اہل علم کے نزدیک عالم باعمل کی ہوسکتی ہے۔یا پھر کوئی بھی شخص جسے اپنا آئیڈل تصور کر لیتا ہے۔اسے قلب ونظر میں یہ مرتبہ عطا کر دیتا ہے۔لیکن ایسی شخصیتیں بہت کم ہوتی ہیں جو مذکورہ بالا میں سے نہ ہوتے ہوئے بھی دلوں پر حکمرانی کرتی ہیں جن سے کمپیوٹر کے ذریعہ آن لائن اور فون پر گفتگو کر کے مسرت اور محبت کا احساس ہوتا ہے۔جن کی تصویر دیکھ کر احترام وعقیدت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور جن کا ذکر خیر باعث اطمینان قلب ہوتا ہے۔دراصل ایسے اشخاص انتہائی بلند کردار اور اعلیٰ درجہ کے انسانی بالخصوص ،اسلامی اخلاقیات کے حامل ہوتے ہیں۔حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کی ادائیگی کو پورے شعور کے ساتھ نہ صرف فریضہ تصور کرتے ہیں بلکہ ہر وقت اسے عملی طور پر انجام دینے میں پس وپیش سے کام نہیں لیتے۔ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ سے بے نیاز ہو کر ادبی اور انسانی خدمت کرتے ہیں۔میری نظر میں ایسی بہت کم شخصیات میں سے ایک ناصر ملک بھی ہیں جو اپنے مرتبہ ومقام علمی حیثیت جذبۂ انسانی خدمت منسکر المزاجی ،مہمان نوازی،ایثار وقربانی اور اردو واہل اردو سے بے لوث محبت کی وجہ سے وہ بڑی قدآور شخصیت کے مالک ہیں ۔جسے عام قد وقامت والوں کے درمیان ناصر ملک صاحب کی شعری اور نثری تخلیقات میں سے کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جو آن لائن بھی ان کے ویب سائٹ پر دستیاب ہیں۔مجھے اعتراف ہے کہ موصوف کی جملہ کتابوں کے مطالعہ کا موقع فراہم ہوا ہے۔میں نے ان کے آن لائن میگزین اردو سخن کے دیباچے اور دیگر ادبی تقریبات میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے علمی موضوعات پر پیش کی گئی تقاریر کو پڑھنے کا موقع ملا ہے۔کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک مستند علمی شخصیت اور معتبر ادیب ہیں۔ان کا مشاہدہ اور مطالعہ بہت وسیع ہے ۔ناصر ملک صاحب کی شخصیت ہر اعتبار سے قابل تقلید ہے۔اہل پاکستان بالخصوص اردو کے لیے موصوف کی اس ارض بہشت میں یعنی مراد ان کی آبائی وطن سے ہے۔میں موجودگی کو نعمت غیر مترقبہ ہے۔

ہتھیلی جو کہ ناصر ملک کا شعری مجموعہ ہے اس میں حمد ونعت ،غزلیں ،نظمیں اور آزاد نظمیں شامل ہیں ۔ناصر ملک نے اس مجموعہ میں تمام شعری وفنی تقاضوں کو برتتے ہوئے مختلف موضوعات مثلاً انسانی جذبات واحساسات کی ترجمانی اور قومی ملی کے مسائل کی طرف اشارہ کیا ہے۔بعض نظموں میں زندگی کے تلخ تجربات کو بیان کیا ہے۔ یا اس شعری مجموعہ کے ذریعہ بالخصوص مجموعے کے آخر میں پنجاب وسندھ میں 2010 میں آئے سیلاب میں ہونے والی تباہی وبربادی سے متعلق تخلیقات پیش کی ہیں۔ناصر ملک کا شعری سفر اس مجموعہ میں پختہ اور حساس نظر آتا ہے۔ان کا انداز ہ پیش کش ،موضوعات اور مسائل زندگی کے مطالعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔

مہندی سے اِک خواہش اپنے ہاتھوں پر
سکھیاں لکھ کر چوری چوری پڑھتی ہیں

زندگی میں امید اور ناامیدی کی کیفیت ان کی شاعری کا حصہ ہے۔وہ زندگی سے مثبت نتائج اخذ کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔لیکن ان کی نظر موجودہ دور کے نظام حیات پر گہری ہے۔ان کی امیدیں جہاں ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں وہیں وہ پرامید بھی نظر آتے ہیں۔

چراغِ شب جلا کہیں ؟ نہیں ، نہیں ، ابھی نہیں
سحر نے ڈھونڈ لی زمیں ؟ نہیں ،نہیں ، ابھی نہیں

ان کی شاعری میں کلاسیکی موضوعات کی رنگارنگی بھی خوب نظر آتی ہے۔مقتل،جگنو،چشم جیسے الفاظ سے تغزل کا انداز پیدا کرنے کا ہنر خوب آتا ہے۔مثلاً

چشمِ تر میں نقوش لرزاں ہیں
غم یہاں بے لباس ہے میرا
جگنوؤں کو اُجال رکھا ہے
اس کا ملنا قیاس ہے میرا
ہیں بدن پر حقوق مقتل کے
دل مگر اُس کے پاس ہے میرا

جہاں ایک طرف قدیم روایتوں کے پاسداری ہے وہیں فرسودہ نظام سے بغاوت واحتجاج بھی موجود

ہے۔عمل کے مقابلہ جتنے بھی بے عملی و پر مبنی خیالات کا رواج ہے وہ اس پر ضرب لگاتے ہیں۔ ہتھیلی کو استعارہ بنا کر زندگی کے مختلف جہات کی اشارہ کرتے ہیں۔شعر ملاحظہ ہو۔

لکیروں کو مٹا بھی دو، لکیریں مار دیتی ہیں
ہتھیلی کاٹ پھینکو ناں، ہتھیلی مار دیتی ہے
اے لڑکی! اِس ہتھیلی سے بغاوت ہو نہیں سکتی
اگر یہ رُوٹھ جائے تو محبت ہو نہیں سکتی
یہی تو لمس دیتی ہے شروعاتِ تعلق کو
سمندر ہے ، سمندر سے عداوت ہو نہیں سکتی
ہتھیلی کی لکیروں میں چھپے ہیں اوس کے موتی
مگر بے فیض ہاتھوں سے کرامت ہو نہیں سکتی
سنو! اپنی شرارت یا پہیلی مار دیتی ہے
ہتھیلی سے نہ اُلجھو یہ ہتھیلی مار دیتی ہے

زندگی کے تگ ودوہ میں انسان آج بھی ..... کے زمانہ سے آگے نہیں بڑھ پایا ہے۔آج بھی اسے سخت محنت ومشقت کے عوض دو وقت کی خوراک میسر نہیں ہوتی۔ کہنے کو زمانہ نے تو بہت ترقی کر لی ہے اور زیست کو آسان سے آسان تر بنانے میں انسان نے نئے نئے آلات خلق کر لیے ہیں اور نئی نئی ترکیبیں ایجاد کر لی ہیں۔لیکن ایک عام شخص کیا ان وسائل سے فیضیاب ہو پاتا ہے جواب نفی میں ملے گا۔ناصر ملک اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں۔ان کی نظر سماجی وسائل کی طرف گہری ہے۔مثلاً

یہ اور بات قافلے سرعت سے چل دیے
وہ شخص راہِ زیست میں اَب بھی کھڑا تو تھا
پلتا ہے غریبوں کی کمائی پہ جو بدبخت
رہزن ہے حقیقت میں وہ مخدوم نہیں ہے

جب بھی تشدد یا مذہبی منافرت نفرت کے عوض بے گناہوں کی جانیں جاتی ہیں اور برسہا برس انصاف کے لیے گجرات کے اندر ذکیہ جعفری جیسے در در کی ٹھوکریں کھاتے ہیں تو ناصر ملک کا دل کرب سے تڑپ

اٹھتا ہے۔

ساٹھ برسوں بعد بھی بوڑھی زبانوں پر ملے
حرص کے مارے ہوئے بلوائیوں کے تذکرے

جب بھی ظلم و جبر نے سر اٹھایا ہے تو ادیبوں اور قلم کاروں نے اس کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ آواز بلند کرنے کے نتیجہ میں حکمراء طبقہ نے ادیبوں اور شاعروں کو زدوکوب بھی کیا۔ فیض اور حبیب جالب جیسے شاعروں کو جیلوں میں ڈالا گیا اور کبھی جعفر زٹلی کی طرف شہید بھی کیا گیا۔ لیکن ناصر ملک نے اپنا فرض نبھاتے ہوئے اس مسئلہ کی طرف اپنی شاعری میں اشارہ کیا بتا کہ ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کو حق گوئی کا حق حاصل ہو سکے۔

کبھی اِس جرم کی پاداش میں ایسا ہوا بھی ہے
کہ شاعر یا کہانی کار مقتل میں کھڑا ہو اور
اسے اتنی اجازت بھی نہ ہو کہ گفت گو کر لے
گھڑی بھر دیکھ لے اُس کو، جسے اُس نے تراشا ہو
جسے ترتیب بخشی ہو، جسے برسوں تلاشا ہو
مجھے منظور ہو گا تم کوئی بھی فیصلہ لکھ دو
میں اپنے ہر ہنر میں بھی اُسے ترتیب دیتا تھا

وادیٔ سوات میں خواتین پر ہو رہے ظلم و جبر کے خلاف اپنی آوازیوں بلند کرتے ہیں۔

(وادی سوات کی ہجرت کے تناظر میں)
ہمارا حوصلہ انصار کا سا تھا مگر اُس کو
ہمارے ناتواں دل سے اسی قصرِ امارت کے
لہو آلود جبڑوں نے اچانک نوچ ڈالا ہے
ہمیں معلوم ہے کل کو ہمارے گھر میں بھی ایسی
ہزاروں میّتوں پہ روٹیوں کے بین گونجیں گے

ناصر ملک کی شاعری میں ہجرت کے کرب کا احساس موجود ہے۔ آبائی وطن سے رخصت ہونے

کے بعد سفر کی صعوبتیں اور نئی منزل کی تلاش وجستجو اور اجنبیت کے احساس کی تڑپ کو انہوں نے جذباتی انداز میں یوں پیش کیا ہے۔

چار کمروں کی جنت کہانی ہوئی
میرے پُرکھوں کی محنت کہانی ہوئی
فصل اُجڑی، شجر، پھول، پودے گئے
ایک پل میں مویشی بھی اوجھل ہوئے
میری املاک کے سب نشاں مٹ گئے
سارے منظر اچانک بیگانے ہوئے
گھر کا رستہ بھی مجھ کو دکھائی نہ دے
کیا کروں آج کچھ بھی سجھائی نہ دے
میری بیٹھک نہ ڈیرہ ، نہ مسجد یہاں
دادی اماں نہ دادا کا مرقد یہاں
اب نہ بہنیں ، نہ بھابھی ، نہ بھائی یہاں
کیوں یہ قسمت مجھے لے کے آئی یہاں
میرا گھر ، میری دُنیا ٹھکانے لگی
زندگی کس طرف لے کے جانے لگی
نام درکار ہے اِس کڑے درد کو
زندگی چاہیے آخری فرد کو

ماں کی عظمت اور اس کی تقدس پر اشعار کہتے ہیں۔

چارہ گر ! بس مجھے سائباں چاہیے
چند لقمے نہیں لختِ جاں چاہیے
گھر کے سامان کا تذکرہ مت کرو
اور کچھ بھی نہیں، مجھ کو ماں چاہیے

ماں اس کائنات میں زندگی کا سرچشمہ ہے ۔اس کا سایہ ہی کسی بھی شخص کی زندگی میں کامیابی کی ضمانت ہے ۔ ہندوستان کے قدیم مذاہب میں اپنے وطن کو ماں کا درجہ دیا گیا ہے ۔ناصر ملک زندگی دینے والے اور زندگی کی حفاظت اور پرورش کرنے والے دونوں سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور ان کی عظمت کے قائل ہیں ۔کسی بھی آفت ،مصیبت، یا پریشانی میں انسانوں کی مدد کرنا ہی سب سے بڑی عبادت ہے ۔پنجاب میں آنے والے سیلاب میں رضا کاروں کے لیے کہی گئی نظم میں وہ کہتے ہیں کہ

وہ جو موت کی آنکھ میں آنکھ ڈالے
وہ پانی میں پھنسے ہوؤں کو نکالے
وہ معدوم ہوتی ہوئی چیخ سن کر
اجل کے شکنجے سے بیٹی چھڑا لے
کہیں مامتا کو تڑپتا نہ چھوڑے
کہیں باپ کی زندگی کو بچا لے
وہ ساگر میں پیاسوں کو پانی پلائے
وہ بھوکوں کو کھانا کھلا کر دعا لے
خبر دے وہ بیمار کو زندگی کی
وہ تن ڈھانپ کر آخرت بھی کما لے
وہ صدیق ثانی بنے ، گھر لٹا دے
وہ انصار بن کر مہاجر سنبھالے
وہ دریا سے ، پتھر سے ، آفت سے لڑ کر
کسی ایک ہی زندگی کو بچا لے

رضا کاروں کو جنہوں نے اپنے جانوں پر کھیل کر آفت آسمانی کی چنگل سے چھڑانے کے لیے خود اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈالتے ہیں۔

بیٹے کے ہاتھ سے نیا بستہ پھسل گیا
بیٹی کا تھا جہیز جو دریا نگل گیا

سیلاب سے ہوئی بربادی وتباہی کا ذکر بہت ہی جذباتی انداز میں کیا ہے۔ یہاں ان کا رنگ کربلائی مرثیے سے جاملتا ہے۔ وہیں کرب وہ اندوہ جو کہ تاریخ اسلام کا حصہ ہے۔ ناصر ملک اس حادثہ میں محسوس کرتے ہیں جس میں سیلاب نے ہزاروں بے گناہوں کو نگل لیا تھا۔

ناصر ملک اپنی شاعری میں ایک پختہ کار شاعر کے حیثیت سے موجودہ دور کے صف اول کے شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اس کا اندازہ ان کیشاعری کی مطالعہ سے بحسن وخوبی کیا جاسکتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہو۔

یہ کس مقام پر ہمیں خدا نے لا کھڑا کیا
کوئی بتائے تو سہی کہ جرم ہم نے کیا کیا
یہ دھوپ کتنی تیز ہے ، کھلا ہے سر پہ آسماں
یہ بھوک بھی بلا رہی ہے ایک مرگِ ناگہاں
نگل گئی ہے پیاس میرے نونہال سینکڑوں
یہ آگ چاٹ کر چلی ہے باکمال سینکڑوں
جنہیں بچا رکھا تھا میلی آنکھ سے، وہ بیٹیاں
اَب عالمِ بے پردگی کی نذر ہو گئیں یہاں
یہ سیلِ بے ثمر ہمیں بھکاریوں کے روپ میں
کھڑا کیے ہے محوِ رقص دل شگاف دھوپ میں
سیاستِ وطن کا فیض ، بہہ گئے غریب گھر
وہ دشمنانِ قوم کی بچی رہی زمیں مگر
ہماری بے کسی کے اشتہار کس قدر بکے
مذاکروں کے نام پر کھلے ہیں اور مَے کدے
ہمارے نام پر برس رہی ہیں زر کی بارشیں
سجی ہوئی ہے منظروں سے ہر دکان دیکھ لیں

غریب کا معاوضہ حکومتوں کا مال ہے
فریب ہے ، یہ مقتدر کی بھوک کا سوال ہے
مرے خدا ! وطن کی سرزمین مجھ پہ تنگ ہے
مری طرف اُٹھی ہوئی نگاہ سرخ رنگ ہے

مذکورہ نظم میں خدا سے شکواہ کے انداز میں قومی بیضاعتی کا ذکر کرتے ہوئے فریادکناں ہیں کہ خدا کی آفت سے کب نجات ملے گی۔ جب بھی کوئی آفت اور مصیبت آتی ہے تو غریب اور متوسط طبقہ کے لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ جبکہ حکمراطبقہ کے لوگ اظہارافسوس کے بجائے اس لیے خوشیاں مناتے ہیں کہ امداد کی رقم کو کس طرح اپنی ذاتی تصرف میں لیا جائے۔ وہ اس کی ترکیبیں کرنے لگتے ہیں۔ ہندوستان ہو یا پاکستان یا بنگلہ دیش ہر جگہ کے مسائل ایک جیسے ہیں۔ شاعروادیب کی ذمہ داری بھی سرحدوں کو نہیں دیکھتی۔ بلکہ جب بھی انسانیت کا خون ہوتا ہے ایک سچا اور حساس شاعراس کرکو ذاتی کرب کی طرح محسوس کرتا ہے۔ ناصر ملک کا شمار انہیں شعراء میں کیا جاسکتا ہے۔

میرے مہمان ! بہتر پتا ہے تجھے
ہم ازل سے کڑی آفتوں میں رہے
خون، جنگ و جدل، زلزلے، آگ بھی
حکمرانوں کے ناوقت کے راگ بھی
آمریت نے توڑا ہمیں بارہا
عہدِ جمہور بھی خون پیتا رہا
ٹیکس کے عوض میں لوڈ شیڈنگ ملی
قحط و بحران کی آگ جلتی رہی
ملک دو لخت ہو کر سسکتا رہا
بینک بیلنس وزیروں کا بڑھتا رہا
اک سپاہی کا ڈنڈا ہی قانون ہے
سلطنت بھی وڈیروں کی مرہون ہے

لاکھ بھونچال ہوں ، لاکھ سیلاب ہوں
رہزنوں کے خزانے تو سیراب ہوں
میرے مہمان ! یوں دل نہ میلا کرو
چند لقمے مرے پاس ہیں ، بانٹ لو
میں نہ ممبر ، وڈیرا ، نہ سردار ہوں
ہاں مگر میں ہی تیرا الم خوار ہوں
ہم غریبوں میں گر یہ جہالت نہ ہو
ان لٹیروں کی ہم پر حکومت نہ ہو

سیلاب کے باوجود امراؤ کے خزانے بھرتے ہی جا رہے ہیں ۔ جہاں ایک طرف انسانیت سسک سسک کر دم توڑ رہی ہے وہیں دوسری طرف ذخیرہ اندوزی میں بڑے بڑے لوگ مصروف ہیں ۔اس پر شدید طنز کیا گیا ہے ۔ناصر ملک کی شاعری کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ انہیں انسانیت سے ہمدردی اور ظلم سے نفرت وبغاوت ہے ۔وہ اپنی بات بے باکی سے کہہ دیتے ہیں ۔ان کی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جب بھی سماجی وملی یا قومی مسائل کی طرف توجہ دلاتے ہیں ان کا شعری آہنگ کبھی متاثر نہیں ہوتا اور یہ ہنر ایک عظیم شاعر وفنکار کی عظمت کی دلیل ہے ۔ یہاں سے ان کی شاعری سے متعلق خصوصیات پر ایک طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے جبکہ وہ اپنی ہمہ جہت خصوصیات کی وجہ سے عالمی پیمانہ پر شہرت کے حامل ہیں ۔ چونکہ وہ ابھی بھی ایک فعال ادیب ودانشور کے حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں ۔ پوری اردو دنیا میں تمام برقی مجلّہ واخبارات سے متعلق صحافیوں کی اپنے برقی مجلّے کے ذریعہ رہنمائی فرما رہے ہیں ۔موجودہ دور میں ایک مرد مومن کا یہی جہاد ہے ۔ہم امید کرتے ہیں کہ وہ اپنی قارئین کو اپنی تحریروں افکار وخیالات سے سرفراز کرتے رہیں گے ۔

☆☆☆

تہذیبِ غزل کے دو شاعر فراق اور فیض کے فکر و فن پر ایک نظر

بنٹی فرید علی سید
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو
موہن لال سکھاڑیہ یونیورسٹی،
اودے پور، راجستھان

ملخص

فراق گورکھپوری اور فیض احمد فیض اردو زبان و ادب کے نامور عالم، مایہ ناز مورخ، جدید انشا پرداز، نقاد، ادیب و شاعر ہیں۔ انھوں نے اردو شعر و ادب کی نہ صرف دل و جان سے خدمت کی ہے بلکہ اس کو نئی جہتوں سے بھی روشناس کرایا۔ فراق گورکھپوری اور فیض احمد فیض کو اندازہ تھا کہ آنے والا وقت حقیقت شناسی اور سچائی کا متلاشی ہوگا جس میں خالص تصوراتی فکر و خیالات کو تصنع سے تعبیر کیا جائے گا۔ فراق اور فیض کا مطالعۂ دین و دنیا، زمانہ شناس، مستقبل شناس، دورس نگاہیں اور فکر و خیال زمانے کی سمت و رفتار کو بہت پہلے ہی بھانپ لیا تھا۔ چنانچہ دونوں کے افکار و نظریات میں اصلاح قوم، بیداری قوم، تعلیم و تربیت اور شعر و ادب کی مقصدی نشو و نما کو اولیت حاصل تھی۔ اور اس لائحہ عمل کو زندگی کا مقصد بنا کر تا حیات اسے مکمل کرنے میں صرف کر دیا۔ فراق اور فیض کی نظموں اور غزلوں زبان زدِ عوام ہیں انھوں نے اپنے زمانے کو اس وقت کے حالات کو اپنی شاعری میں اس کچھ اس طرح سمو دیا ہے کہ ان کی بات دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔

☆☆☆

اردو زبان و ادب میں فراق گورکھپوری اور فیض احمد فیض عبقری شخصیت کے مالک

تھے۔پچھلے کچھ سالوں سے برِصغیر ہندو پاک میں پیدا ہونے والے حالات اہم اور قابلِ ذکر سیاسی اور سماجی حالات تہذیبی تحریکوں کی بہت سی پرچھائیاں ہمیں فراق اور فیض کے کلام میں مل جاتی ہیں۔قوس وقزح کا رنگ پیش کرتی ہیں۔ان کی شاعری فکر وفن کا حسین اور خوبصورت سنگم ہے۔ فراق اور فیض کی شاعری کے تمام اشعار کے ایک ایک لفظ سے ہمیں ان زمانے وقت اور حالات کی کشمکش کا احساس ہوتا ہے۔انھوں نے عملاً مزدوروں کے مسائل سے دلچسپی لی اور ان تمام باتوں کا اثر فراق اور فیض کی شاعری پر صاف ظاہر ہوتا ہے۔فیض بیک وقت غزل اور نظم دونوں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔فیض ترقی پسند تحریک کے میر کارواں ہیں۔ ان کے کلام میں افسردگی اور دردوغم کے باوجود نا امیدی اور شکست کے جذبات نہیں ملتے ہیں۔فیض کا عزم پختہ اور مستحکم ہے۔ان کو اعتماد ہے کے زمانے کے ظلم وستم اور قید و بند کی صعوبتیں ان کے ارادوں اور مقاصد میں حائل نہیں ہو سکتے۔فیض کی ابتدائی شاعری کا مرکز حسن وعشق اور رمانیت رہا ہے مگر جب اشتراکیت سے وابستگی ہوئی تو فیض نے شاعری کے فنی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے عشق مجازی کی جگہ غم دنیا غم بنالیا۔

نقش فریادی، دست صبا، زنداں نامہ، دست تہ سنگ وغیرہ مجموعی پر غور کرنے پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ فیض نے اپنی شاعری میں غم دوراں کو غم جاناں بنا کر پیش کیا ہے۔فیض اگر چہ اشتراکیت کے علم بردار تھے لیکن انھوں نے پہلے شاعری کے فنی تقاضوں کو اولیت بخشی اور اشتراکیت کے دوسرے درجے پر رکھا۔دراصل فیض جذبات میں آکر ہنگامہ بپا کرنے والوں میں سے نہیں بلکہ ان کے مشاہدوں اور تجربات نے ان کی شاعری کو حقیقت سے قریب کر دیا ہے۔

روحِ کائنات ،گل نغمہ، روپ ، ساز، غزلیستان، شعرستان، دھرتی کی کروٹ ، گلبانگ، شبنمستان، مشعل وغیرہ شعری مجموعوں کا مطالعہ کرنے سے فراق کی شاعری اور عشق کے مختلف روپ سامنے آتے ہیں۔فراق غزل کے مشہور شاعر ہونے کے علاوہ نظم اور رباعی کے ممتاز شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔فراق نے ابتدائی دور میں امیر مینائی کے شاگرد وسیم خیرآبادی سے اصلاح لی۔فراق کی ابتدائی شاعری میں امیر مینائی کا بھی اثر نظر آتا ہے۔آپ

نے قدیم شعری روایات سے استفادہ کیا۔ میرؔ، مرزا غالبؔ، مصحفیؔ، حسرتؔ موہانی، فانیؔ کی شاعرانہ خوبیوں سے بھی فراقؔ نے استفادہ کیا۔ان کے کلام میں وہی سوز وگداز و دردمندی ہے جو میرؔ کے کلام میں موجود ہے۔فراق نے ایک مرتبہ کہا تھا آنے والی نسلیں تم پر فخر کریں گی کہ تم نے فراق کو دیکھا تھا۔فراق عہد جدید کے ان غزل گوشعراء میں سے ہیں جس نے اردو کی عشقیہ شاعری میں ایک نیا موڑ پیدا کر دیا ہے۔ جو کسی سنگ میل سے کم نہیں ہے۔ ڈاکٹر فخر والاسلام اعظمی لکھتے ہیں:۔

'' غزل کی نشاۃ ثانیہ اور اس کی رگوں میں نئے نئے فکر و خیال کا خون دوڑانے والوں میں فراق کا نام کئی وجوہ سے اہمیت کا حامل ہے جن کی غزل میں ماضی کی صحت مند روایتوں کے ساتھ ساتھ ان کے عہد کے ارتعاشات اور تھرتھراہٹیں اس طرح شامل ہوگئی ہیں کہ ان کی مثال اردو شاعری میں کمتر نظر آتی ہیں۔''

فراق اور فیض نے انگریزی کے استاد تھے۔انھوں نے انگریزی شعراء کا مطالعہ کیا اور ان کو اپنے شاگردوں کو پڑھایا بھی۔جس وجہ سے وہ دوسری زبانوں کے شاہکاروں تک پہنچے اس مطالعہ سے ان کے ذہن کو اور وسعت اور گہرائی ملی۔انگریزی کی رومانی شاعری کے دل داہ اس کے ساتھ ہندوستانی تہذیب کے بھی پروردہ اور تربیت یافتہ تھے۔معاشرت اور ادب کے مطالعے اور مشاہدے اور پھر ان کی ذاتی سوچ نے زندگی سے متعلق جو عرفان ان کو دیا۔کہیں کہیں اس نے ان کی شاعری کو عارفانہ اور فلسفیانہ رخ دے دیا ہے۔ جب شاعری میں فلسفہ، تخیل اور تصور کا لازمی جز بن جائے اور طرزِ حیات ہی نہیں تخلیقی کائنات میں رچ بس جائے تو وہ بہترین کا نامہ بن جاتا ہیں۔فراق اور فیض کی شاعری میں فطرت کے حسین رنگوں کا جو عکس ہے وہ انہیں کی دین ہے یہ اثرات ان کے تنقیدی رجحانات میں بھی نظر آتا ہے۔فراق اور فیض کی شاعری میں ہندستانیت روح کر چھائی ہوئی ہے۔جس میں اپنے وطن کی مٹی کی خوش بو بھی ہے اور فضا کی دھوم بھی ہے جس میں اس کی شاعری اور زندگی پروان چڑھی۔اپنی تہذیبی قدروں کو وہ نظر انداز کر

پاتے جواس ملک کی قدیم میراث ہیں۔

فراق اورفیض اردو کے ممتاز غزل گواور بیسویں صدی کے مقبول ومنفرد شاعر ہیں۔ان کی شاعری میں برصغیر کی ہر سیاسی سماجی اورادبی تحریکات کی بازگشت،صاف سنائی پڑتی ہےان کی شاعری میں صداقت پائی ہے۔یاس اور ناامیدی کے بجائے ان کے یہاں مردانہ ارحالات سے مقابلہ بھی ملتا ہے۔امید پرستی زندگی پر اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ان کی فنکاری ہمیں حوصلہ اور ہمت عطا کرتی ہے یہی ہمیں زندگی سے محبت کرنا سکھاتی ہے۔فراق اورفیض کی شاعری بڑی پرکشش ہے۔اس میں پرانی شاعری کی رچی کیفیت ہی نہیں بلکہ ایک نیا رچاؤ ہےانگریزی ادب کا اثر بھی ہے ایشائی تہذیب کے عناصر بھی ہے۔ان کا ذہن منظّم اورفنی شعور بہت ترتیب یافتہ ہے۔ وہ ہر بات نہایت واضح طور پر بڑی آسانی سے کہہ دیتے ہیں۔آپ دونوں کلاسیکی مزاج رکھتے تھے روایت پرست تو نہیں ہاں استفادہ ضرور کیا۔فراق اورفیض کی غزلیں جذباتی رومانیت کے ساتھ ساتھ حقیقت پسندی کی بھی جھلک صاف نمایاں ہے۔دنیا کے تمام انسانوں کا دردوغم ان کی غزلوں میں نظر آتا ہے۔

فراق اورفیض کی شاعری اپنے وقت اور حالات پر بہت خوبصورت تبصرہ ہے۔ان کا زمانہ سیاسی،سماجی طور پر بڑی ہلچل کا زنانہ تھا۔جس کا اندازہ ہمیں ان کی شاعری سے بخوبی ہوتا ہے۔فراق اورفیض کیا شعار کے ایک ایک لفظ سے ہمیں ان کے زمانے وقت اور حالات کی کشمکش کا احساس ہوتا ہے۔آپ نے عملاً مزدورون کے مسائل سے دلچسپی لی۔ فراق اورفیض کا مغربی ادب کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔فراق کی غزلوں کا خاص موضوع حسن وعشق ہے ان کی عشقیہ شاعری ہے۔جس میں ایک خاص جمالیاتی احساس بڑے دلکش انداز میں موجود ہے۔ ایک والہانہ پن اورسرشاری ہر جگہ موجود ہے کہیں کہیں بلا کا سوز وگداز اورغم انگیزی ہے۔غم اورمسرت دونوں ساتھ ساتھ ملتے ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں :

کس لیے کم نہیں ہے درد فراق اب تو وہ دھیان سے اتر بھی گئے

فضا تبسم صبح بہار تھی لیکن اب تو وہ دھیان سے بھی اتر گئے
زندگی کیا ہے آپ سے اے دوست سوچ لے اور اداس ہو جائیں
موت کا بھی علاج ہے لیکن زندگی کا کوئی علاج نہیں
اس دور میں زندگی بشر کی بیمار کی رات ہو گئی ہے
عمر فراق نے یوں ہی بسر کی کچھ غمِ دوراں کچھ غمِ جاناں
ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہ گزر پھر بھی
ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

فراقؔ کا عشق انسان کا عشق تھا۔ایسا عشق جو دل و دماغ میں ستاروں کی چمک اور سوز و گداز پیدا کر دے۔فراق نے غزل کو نئے انداز نظر اور نئے تہذیبی شعور سے آشنا کیا۔اور اسی نسبت سے ان کے یہاں نئی تشبیہات کے بھی نمونے ملتے ہیں۔اردو کی عشقیہ شاعری کو بھی انھونے آپ نے نئے فکری زاویے سے دیکھا۔فراق کو جمالیات کا شاعر یا شاعرِ جمال بھی کہا گیا ہے لیکن فراق کی جمالیات صرف حسن و عشق تک محدود نہیں ہے۔یہ حقیقت ہے کہ ابتداً ان کے یہاں بھی حسن و عشق کے روایتی مضامین ہیں لیکن رفتہ رفتہ جب انھوں نے اپنی آواز کو پالیا تو اس میں ہندوستانی تہذیب،فطرتِ انسانی اور زبان و بیان کا ایسا رس گھل گیا جو آگے چل کر ان کی اپنی آواز اور اپنی پہچان بن گیا۔مناظرِ قدرت سے تو فراق بچپن سے ہی متاثر تھے آگے چل کر فراق نے انھیں زبان دے دی،خصوصاً نظموں میں اس کا جادو بولتا نظر آتا ہے۔غزلوں میں بھی اس کیفیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

فراق اور فیض کی شاعری صرف حسن و عشق کے جلوؤں تک ہی محدود نہیں ہے اس میں زندگی اور زمانے کے مسائل اور تقاضے بھی شامل ہیں۔ وہ انسان کی زندگی میں پائی جانے والی محرومیوں اور ناکامیوں کو خوب سمجھتے ہیں۔فراق اور فیض پوری کائنات کو لے کر چلنا چاہتے ہیں جس میں غم دوراں بھی ہے اور جاناں بھی ہے۔ان تمام خوبیوں کی آمیزش نے فراق اور فیض کی

غزلوں کو جلا بخشی ہے ۔ فراق اور فیض کی عظمت کا راز ان کی شاعری اور نثر ہی نہیں بلکہ ان کی شخصیت کا انوکھا پن بھی ہے۔ تشبیہوں اور استعاروں میں ہندوستانی عنصر ہے۔ ان کی غزل گوئی میں نئی علامتوں کا درجہ رکھتے ہیں۔

فراقؔ اور فیضؔ کا مغربی ادب کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے زندگی کو اس کی تلخیوں کو اس کی رنگینیوں کو اور زمانے کے نشیب و فراز کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ فرسودہ تہذیب شان و شوکت اور عیش و عشرت کا اظہار انہوں نے غزل اور نظم میں بخوبی کیا ہے۔ فیض اور فراق نے پرانی روایات کو ایک نئے رچاؤ کے ساتھ پیش کیا ہے اور پرانی علامتوں کو نئے پس منظر میں پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی پرانی روایات کا احترام بھی کرتے ہیں۔

فیض احمد فیض انتہائی سادہ اور خوبصورت شخصیت کے مالک تھے ان کا مزاج بہت نرم تھا اور مزاج کی یہ نرمی ان کی شاعری میں جگہ جگہ محسوس کی جاسکتی ہے۔ تمثیلی پیرائیہ اور رمز و کنایہ فیض کی اشاعری کا اہم جزو ہے۔ فیض کی ابتدائی شاعری کا محرک انتظار اور تنہائی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے اپنے عہد کو جس انداز سے پیش کیا ہے وہ بھرپور اور نہایت موثر انداز میں ہے۔ یہ قابل تعریف لائق تحسین ہے۔ وہ خاص طور سے اپنے وقت کے اپنے عہد کے مظلوموں، دبے کچلے افراد وطبقات اور اقوام کے لیے اظہار کا وسیلہ بنے ہیں۔ فیض غزلوں میں جذباتی رومانیت کے ساتھ ساتھ حقیقت پسندی کی جھلک نظر آتی ہے۔ فیض کو ساری دنیا سے محبت تھی وہ ایک طرح سے علمی شہرت رکھتے تھے۔ ترقی پسند ذہن رکھنے کی وجہ سے یوں بھی وہ قومی تعصب اور مذہبی تنگ نظری سے بالاتر ہو گئے تھے۔ انھوں نے بارہا یورپ کا دورہ کیا رشیا گئے، وہاں کے اہل علم اور اصحاب ادب سے ان کی دوستی بھی تھی۔ لیکن وہ ہندوستان کے وفادار تھے اور وفادار رہے۔ وہ ہر بات نہایت واضح طور پر بڑی آسانی سے کہہ دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں چند خوبصورت اشعار ملاحظہ ہوں :۔

متاع لوح وقلم چھن گئی تو کیا غم ہے کہ خون دل میں ڈوبو لی ہیں انگلیاں میں نے

لبوں پر مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے ہر اک حلقہ زنجیر میں زباں میں نے
مقام فیض میں کوئی راہ میں جچا ہی نہیں جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے
دنیا نے تیری یاد سے بے گانہ کر دیا تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے
وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے
گلوں میں رنگ بھرے بادنو بہار چلے چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے
دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گزار کے
رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام موسم گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

فیض احمد فیض کی شاعری حسن معنیٰ کا بڑا حسین امتزاج ہے۔فیض کے یہاں جو انداز نظر اور طرز فکر ان کی غزلوں کو ایک خاص رنگ و آہنگ بخشتا ہے اس کا اندازہ ان کی غزلوں سے بھی ہوتا ہے۔فیض کا وہ لہجہ جو تمام تر دکھ اور تکلیف کے باوجود زندگی سے بھرپور ہے کہیں جمود طاری نہیں ہے۔ درد تو ہے مگر کہیں بھی شکست کا احساس نہیں ہے۔سخت حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے کہیں بھی غصہ اور نفرت کے ساتھ نظر نہیں آتے بلکہ اپنی بات سمجھا کر نرمی اور شائستگی کے ساتھ کرتے ہیں۔

فراق اور فیض نے تمام شعری محاسن کو جس وضع داری سے نبھایا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔فیض اور فراق بذات ایسے انسان تھے جن کے دل میں دنیا کا درد سمٹ کر آ گیا تھا۔جو دوسروں کی تکلیف کو دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں۔انہوں نے ہمیشہ ایک ایسی دنیا کی تمنا کی جہاں لوگوں میں ایک دوسرے سے محبت ہو اور یہ پاک جذبہ ان کی شاعری کے ذریعہ ظاہر ہوتا ہے۔آپ دونوں نے اپنے اس فن کو خون جگر سے سینچا ہے۔فراق اور فیض کی نظمیں اور غزلیں اپنے اندر ان گنت خوبیوں کو سموئے ہوئے ہیں جو اردو شاعری کی جان ہیں۔

کتابیات :-

[1] تلاشِ فکر وفن - پروفیسر حدیث انصاری

[2] اردو غزل گوئی -فراق گورکھپوری

[3] اردو غزل کی روایت اور ترقی پسند غزل - ممتاز الحق

[4] اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب- پروفیسر گوپی چند نارنگ

[5] بیسویں صدی کے اردو شعر وادب پر سرسید تحریک کے اثرات-ڈاکٹر سید فیروز علی

[6] مولانا حالی اور شبلی کا فکری شعور کا موازنہ - ڈاکٹر حلیمہ بانو

☆☆☆

مختار ٹونکی: راجستھان کے اہم افسانہ نگار

ریسرچ اسکالر:
سلطانہ فاطمہ انصاری،
کوٹہ یونیورسٹی،
کوٹہ، راجستھان

نگراں:
ڈاکٹر نادرہ خاتون
لیکچرر اردو، گرمنٹ آرٹس گرلس کالج
کوٹہ، راجستھان

ملخص

دور جدید کے افسانہ نگاروں میں راجستھان کے اہم افسانہ نگار مختار ٹونکی کا نام قابل ذکر ہے۔ان کا شمار راجستھان کے اہم افسانہ نگاروں اور ادیبوں میں ہوتا ہے۔ان کا تعلق راجستھان کے ٹونک ضلع سے ہے۔

مختار ٹونکی بنیادی طور پر طنز و مزاح نگار ہیں۔حالانکہ انہوں نے ادب کی مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔طنز و مزاح نگار میں اپنے جوہر دکھانے کے ساتھ افسانہ نگاری میں بھی اپنی الگ شناخت بنائی ہے۔انہوں نے اردو ادب میں متعدد افسانہ لکھ کر افسانوی ادب میں گراں قدر اضافے کئے ہیں۔

مختار ٹونکی کے افسانوں میں موضوعات کا تنوع ہے۔انہوں نے ہر موضوع کو اپنے افسانوں کا محور بنایا ہے۔اپنی بے پناہ صلاحیتوں اور غیر معمولی ذہانت سے سماج میں رونما ہونے والے واقعات و حادثات کو اپنے افسانوں میں بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔وہ اپنے افسانوں میں عہدے جدید کے فکری تقاضوں و جدوجہد کو بڑی فنکارانہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔وہ

افسانہ نگاری کے ہر نقطہ نظر کو بخوبی انداز میں پیش کرنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ وہ قاری کو باندھے رکھنے کا راز سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ ایسی دلنشین طرز تحریر کا استعال کرتے ہیں۔ جو قاری کی توجہ افسانہ سے منتشر نہیں ہونے دیتی۔ ان کے کردار عام زندگی سے اخذ کئے ہوتے ہیں۔ وہ اعلیٰ طبقے کی نمائندگی نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ اپنے معاشرے کے اوسط طبقے کے لوگوں کو اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں۔

.....

اردو ادب میں افسانہ نگاری کا آغاز بیسویں صدی میں ہوا۔ بیسویں صدی میں تاریخی اعتبار سے کئی سیاسی، سماجی اور ادبی طور پر تبدیلیاں رونماں ہوئی۔ ان تبدیلیوں کے اثرات افسانہ نگاری پر بھی اثر انداز ہوئے اور افسانے میں نئے رجحابات، واقعات اور تحریکات نظر آئے۔ افسانے نے جہاں مختلف تحریکوں کی نئی روش کو اختیار کیا وہی جدیدیت کی راہوں سے بھی ہموار ہوا۔ جدیدیت نے افسانہ نگاری کو نئی سمت و رفتار عطا کی۔ کئی افسانہ نگار جدیدیت کی اس رفتار میں شامل ہوئے۔ دور جدید کے افسانہ نگاروں میں راجستھان کے اہم افسانہ نگار مختار ٹونکی کا نام بھی قابل ذکر ہے۔

مختار ٹونکی راجستھان کے ادبی نسل کے مستعد قلم کار ہیں۔ جو ایک وسیع فکر و نظر رکھتے ہیں۔ ان کا شمار راجستھان کے اہم افسانہ نگاروں اور ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق راجستھان کے ٹونک ضلع سے ہے۔ ٹونک علمی اور ادبی اعتبار سے ایک ممتاز تاریخی اور ادبی اہمیت کا حامل ہے۔ جہاں اردو ادب کی ترقی کے لئے پیش بہاں خدمات انجام دئے گئے ہیں۔ مختار ٹونکی ٹونک کے ادبی و شعری ماحول سے متاثر ہوئے اور ٹونک کے علمی و ادبی سرگرمیوں میں بڑھ چھڑ کر حصّہ لیتے رہے ہیں۔ جس کی جھلک ان کے افسانہ نگاری میں بھی نظر آتی ہے۔ مختار ٹونکی بنیادی طور پر طنز و مزاح نگار ہے اور انہوں نے ادب کی مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ طنز و مزاح نگار میں اپنے جوہر دیکھانے کے ساتھ افسانہ نگاری میں بھی شناخت قائم کی ہے۔ اردو ادب میں متعدد

افسانہ لکھ کر افسانوی ادب میں گراں قدر اضافے کئے ہیں۔

مرحومہ ڈاکٹر عارفہ سلطان نے ۱۹۹۶ء میں اپنی کتاب ''افسانہ راجستھان کے'' میں مختار ٹونکی کے افسانوی سفر کی ابتدا کا مختصر تعارف پیش کیا ہے:۔

''مختار ٹونکی کی افسانہ نگاری کا آغاز دوران تعلیم کالج میگزین سے ہوا۔اس کے علاوہ پہلا افسانہ ''ملکہ دولت'' کے عنوان سے ۱۹۵۹ء میں ہفتہ وار پیام مشرق دہلی سے شائع ہوا تھا۔اس کے بعد متعدد افسانہ مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔جن میں ''خاتون مشرق''، ''ایشیا''، ''بیسوی صدی''، ''نیا دور''، ''جمناتٹ''، ''نخلستان'' اور ''آجکل'' وغیرہ شامل ہیں۔آکاش وانی جے پور سے بھی آپ کے افسانے نشر ہوتے رہتے ہیں۔اوہنری اور چیخوف کے افسانے آپ کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئے۔اردو میں آپ کرشن چندر سے متاثر ہوئے۔آپ کا شمار سینیر قلم کاروں میں ہوتا ہے۔''ٹونک ادبی سوسائٹی'' کے آپ صدر ہیں۔آپ خود لکھنے کے علاوہ نئے لکھنے والوں کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔آپ کے طنزیہ مضامین اور افسانے بھی بہت پسند کئے جاتے ہیں۔''

(''افسانہ راجستھان کے''۔از عارفہ سلطان،ص ۲۱۱)

مختار ٹونکی کے افسانوں میں موضوعات کا تنوع ہے۔انہوں نے ہر موضوعات کو اپنے افسانوں میں شامل کیا ہے۔اپنی بے پناہ صلاحیتوں اور غیر معمولی ذہانت سے سماج میں رونما ہونے والے واقعات وحادثات کو اپنے افسانوں میں بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔وہ اپنے افسانوں میں عہدے جدید کے فکری تقاضوں و جدوجہد کو بڑی فنکارانہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔وہ افسانہ نگاری کے ہر نقطہ نظر کو بخوبی انداز میں پیش کرنے کا ہنر رکھتے ہیں۔جزئیات نگاری ہو،منظر نگاری ہو،مکالمہ نگاری ہو یا کردار نگاری ہر زاوئے سے ان کے افسانہ گراں قدر ہیں۔وہ قاری کو باندھے رکھنے کا ہنر بخوبی جانتے ہیں۔وہ ایسی دلنشین طرز تحریر کا استعمال کرتے ہیں۔جو قاری کی

توجہ افسانہ سے منتشر نہیں ہونے دیتی۔ان کے کردار عام زندگی سے اخذ کئے ہوتے ہیں۔ وہ اعلیٰ طبقے کی نمائندگی نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ اپنے معاشرے کے اوسط طبقے کے لوگوں کو اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں۔

افسانہ ''شاخسانہ'' میں مختار ٹونکی نے موجودہ معاشی صورت حال کا بیان کیا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار اچھو کا پیشہ گورکنی کا ہے۔ جو نصف مہینہ سے نئی قبر کے اضافے کے انتظار میں ہے۔اس افسانے میں انہوں نے اچھو کی ذہنی کیفیت، جدوجہد اور جذبات کو بڑے انوکھے انداز میں بیان کیا ہے:

''تعجب ہے اتنے دنوں سے شہر میں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہوا۔ یہ ٹیکسی ٹرک ڈرائیور کیا کر رہے ہیں؟ کیوں دو چار کو کچل نہیں دیتے؟ آخر اسے بھی تو جینے کا اختیار ہے۔ وہ قبریں کھودنے کا تکلیف دہ اور مشکل کام کرتا ہے اور محنت ومشقت کر کے اپنا خون پسینہ بہاتا ہے، حرام خوری تو نہیں کرتا، بھیک تو نہیں مانگتا.....کوئی عمارت ڈھے کیوں نہیں جاتی؟ کوئی دیوار گر کیوں نہیں جاتی، تاکہ دو چار تو مریں اور پھر یہاں آکر پیوند زمین ہو.....''

(جمنا تٹ۔سہ ماہی مجلّہ۔جلد نمبر ۶، شمارہ ا۔ص ۶۱)

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مختار ٹونکی انسانی نفسیات پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ان کے افسانوں میں موجودہ صورت حال، سماجی، نفسیاتی اور انسانی زندگی کے ہر قسم کے مسائل کا حقیقت پسندانہ اظہار خیال دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں قاری کو دلچسپی کے ساتھ آخر تک باندھے رکھتے ہیں۔انہوں نے اپنے گہرے مشاہدے اور عمیق مطالعہ سے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو اپنے افسانوں کے ذریعہ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

مختار ٹونکی سماج کے ہر پہلوں اور ہر موضوع کو اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنے ماحول کے حقیقی واقعات کو اپنے افسانوں میں ظاہر کرتے ہیں اور حقیقت پسندی کے ساتھ

مقصدیت کو ترضع دیتے ہے۔ان کے افسانوں کا مقصد معاشرے کی اصلاح کرنے کے ساتھ قوم کے افراد کو بیدار کرنا بھی ہے۔

مختار ٹونکی نے افسانے ''بر ہدف'' میں معاشرے کے اس فرسودہ روایت کی عکاسی کی کئی ہے جہاں آج بھی عورت کو پیسے اور جہیز کے خاطر مار دیا جاتا ہے۔مگر ان کا یہ افسانہ فرسودہ روایت کو توڑنے کا کام کرتا ہے۔افسانے کے مرکزی کردار کویتا کو جب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا پتی راکیش اور ساس رکمنی مل کر اس کی غیر قدرتی موت کی سازش کرتے ہیں۔ پہلے تو وہ گھبرا کر وہاں سے فرار ہو جانا چاہتی تھی۔ مگر کچھ غور فکر کے بعد وہ انہیں سبق سکھانے کی سوچتی ہیں اور پلان کے مطابق ساس کی ساتھ شوپنگ سینٹر جاتی ہے اور پھر....

''جب وہ مندر والی گلی کے آخری موڑ پر تھیں تو اچانک سامنے والی گلی سے ایک موٹر سائیکل سوار تیزی سے نکلا اور اس نے کویتا کی طرف نشانہ باندھ کر گولی چلا دی،مگر اس ناگہانی حملے سے پہلے ہی کویتا اُچھل کر اپنی ساس کے پیچھے ہوگئی تھی۔پستول کی گولی اس کی ساس کی سر میں لگی اور وہ فوراً چکرا کر گر پڑی۔دوسرے ہی لمحے گولی کی آواز سن کر لوگ دوڑ پڑے تھے اور گلی میں شور مچ گیا تھا۔صبح کے اخباروں میں ایک سرخی تھی۔ایک بڑھیا کا سنسنی خیز قتل!''

(جمنا تٹ۔سہ ماہی مجلّہ۔جلد نمبر ۸،شمارہ ۲۔ص ۱۷۔۲۷)

مختار ٹونکی کے افسانے بیانیہ انداز میں ہوتے ہیں۔جو قاری کو اپنی دلکشی اور دلچسپی کے باعث آخر تک باندھے رکھتے ہے اور ان کے افسانے کا اختتام قارے کو چونکا دیتا ہے۔مختار ٹونکی کے افسانے کے اختتام پر ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیتے ہے۔وہ اپنے افسانوں کا اختتام او ہنری اور چیخوف کی طرح چوکانے والے انداز میں کرتے ہیں۔اردو افسانہ چیخوف سے سب سے زیادہ متاثر رہا ہے۔ چیخوف کی کہانیوں کے ترجمے اردو زبان میں خوب ہوئے ہیں۔چیخوف کے افسانی نگاری کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے افسانہ کو کلائمکس سے نجات دی۔

ڈاکٹر جمال آراء نظامی چیخوف کے افسانہ کے خاصیت بیان کرتی ہوئی کہتی ہیں کہ:

''چیخوف نے افسانے کو تہہ دار سوچ دیکر تحریک دینے والا گہرا اور جذبات سے پر بنایا اس نے مختصر افسانے میں داخلی کیفیت کے اظہار کے امکانات کو ایک لامتناہی وسعت اور ہمہ گیری عطا کر دی ہے ہم ان کے کرداروں کو چھو کر دیکھ سکتے ہیں۔''

(مختصر افسانے کا ارتقاء پریم چند تا حال ڈاکٹر جمال آراء۔ص۳۳)

موصوف نے بھی چیخوف کے انداز میں کسی مخصوص کردار اور واقعات کے بجائے زندگی کے روزمرہ کے معمولی واقعات و کردار سکے انوکھا پن سے زندگی ایک نیا روپ ہمارے سامنے لاتے ہیں۔چیخوف کا انداز بیان مختار ٹونکی کے افسانوں میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ افسانہ''شاخسانہ'' کا اختتام بھی وہ ایسی چوکانے والے انداز میں کرتے ہیں۔افسانے کا مرکزی کردار اچھو جو کیسی کے مرنے کا انتظار کرتا ہے۔آخر میں اسے اپنے ہی بیٹے کی قبر کھودنی پڑتی ہیں۔جو دنگے میں مارا جاتا ہے۔

اس کو موصوف نے اس انداز میں بیان کیا ہے:۔

''کیا غضب ہو گیا مسیتے ؟ کیوں چلا رہا ہے؟ اس نے پوچھا، کچھ نہیں چچا؛.....وہ کریمہ ہے نہ!.....مسیتا کہتے کہتے رک گیا، کیا ہوا میرے بیٹے کو؟ کہاں ہے وہ؟ اس کے لہجے میں فکر مندی آ گئی۔ چچا.....وہ جلیبی چوک میں دنگا ہو گیا.....بازار کی سب دکانیں بند ہو گئیں۔کریما ادھر سے آ رہا تھا کہ چند گنڈوں نے اسے گھیر لیا اور اس کے پیٹ میں چاقو گھونپ دیا اسکی لاش پولس لے گئی آپ جلدی سے چلیں۔یہ دہشت ناک خبر سن کر وہ سر سے پاؤں تک کانپ گیا، اس پر سکتہ کی کیفیت طاری ہو گئی ،وہ چند لمحے خالی خولی

نظروں سے مسیتے کو دیکھتا رہا اور ہونٹوں میں بڑبڑایا۔دنگا.....لاش.....مردہ....اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے، پھر خاموشی سیاس نے کدالی پھاوڑا اٹھایا اور میکانکی انداز میں قبرستان کی طرف روانہ ہوگیا اسے قبر جو کھودنا تھی اپنے بیٹے کی...... پیارے بیٹے کی۔''

(جمنا تٹ۔سہ ماہی مجلّہ۔جلد نمبر ۶، شمارہ ۱۔ص۔۶۲)

مختؔار ٹونکی اپنے ذاتی تجربات، واقعات اور مشاہدات کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار حقیقت پسندانہ انداز میں کرتے ہیں۔وہ زندگی کے معمولی سے معمولی واقعات کو بھی دلچسپ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ان کے واقعات میں انوکھا پن ہوتا ہیں۔وہ اپنے افسانوں کا تانا بانا اپنے گردوپیش کے ماحول سے اخذ کرتے ہیں۔اپنے افسانوں میں سادہ اور شائستہ زبان کا استعمال کرتے ہیں۔جو قاری کو الجھنے نہیں دیتی۔ان کے افسانوں میں ہم کو سماج اور معاشرے کی جیتی جاگتی تصویر دیکھنے کو ملتی ہے۔وہ سماجی برائیوں اور فسادات پر طنز کرتے ہیں۔مختؔار ٹونکی کے افسانوں میں مزاحیہ عنصر ہونے کے ساتھ طنز کی آمیزش بھی دیکھی جا سکتے ہے۔طنز کی آمیزش ان کے افسانچہ ''درندے''میں نمایاں نظر آتی ہے۔

مندرجہ ذیل اقتباس اس کی وضاحت کرتے ہیں:۔

''بستی میں دنگا بھڑک اٹھا، ایک فرقے کے لوگ دوسرے فرقے کے لوگوں کیساتھ مار کاٹ کر رہے تھے۔آگ دھماکے، چیخ پکار اور بھاگ دوڑ سے ایک ہنگامہ مچا ہوا تھا، لا اینڈ آرڈر، بنائے رکھنے کے لیے پولیس کے نوجوان گشت کر رہے تھے،گلی میں دھوتی سنبھالتے اور ہانپتا کانپتا قصبہ کا سیٹھ دوڑا ہوا آیا اور وہاں پر کھڑے پولیس والوں سے

بولا۔ارے جلدی چلو! درندے میرا گھر لوٹ رہے ہیں، میری عزت آبرو خطرے میں ہے ۔۔۔بھگوان کے لیے۔۔ ۔شاید وہ آگے کچھ اور کہتا کہ تین ڈنڈے اس کے کھپڑی پر پڑے۔ایک چیخ بلند ہوئی اور وہ ہیں پر چکرا کر گر پڑا،دوسرے ہی لمحے ایک ہاتھ اس کے گلے میں پڑی ہوئی سونے کی زنجیر کی طرف بڑھا دوسرے ہاتھ نے انگوٹھی پر قبضہ جمایا اور تیسرے نے اس کی کلائی پر بندھی گھڑی کھول لی۔بستی میں ابھی بھی درندے لوٹ مار کر رہے تھے۔[۱]

(مختار ٹونکی شخصیت اور فن۔ملک فیاض احمد ۔ص ،۲۷۔۲۸)

اسی طرح سے انھوں نے افسانچہ ''سلیکشن'' میں معاشرے کے نفسیاتی پہلو اور سطحی ذہنیت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کسی کا انتخاب یوں ہی نہیں ہو جاتا ہے۔

''لیڈی سیکریٹری کا انٹرویو دینے کے لیے پچاسوں لڑکیاں آئی تھیں، کسی نے یہ عہدہ حاصل کرنے کے لیے سفارش کا سہارا لیا تھا تو کسی کو اپنی تعلیمی ڈگریوں پر بھروسہ تھا چند ایک اپنے حسن کی وجہ سے امید لے کر آئی تھیں لیکن باس نے ایک معمولی سی ناک نقشے والی لڑکی کا انتخاب کیا سب ہی کو حیرت کے ساتھ رشک بھی ہوا کہ آخر کس بنیاد پر اس کو چن لیا گیا،'' رمز انتخاب''منتخب لڑکی نے اپنی سہیلی کے پوچھنے پر اس طرح بتایا کہ ۔۔مجھے خود کو بھی امید نہ تھی کہ باس اتنے پیارے ہونگے میں نے انٹرویو کے دوران ٹیبل کے نیچے سے ان کے پیر پر پیر رکھ دیا تھا۔شاید انھوں نے اشارہ سمجھ لیا ہو۔''

(مختار ٹونکی شخصیت اور فن ۔ملک فیاض احم ۔ص ۲۸)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کی شخصیت مختلف الجہات ہے۔جن میں موجودہ صوت حال سماجی اور نفسیاتی اورا نسانی زندگی کے تمام مسائل کا حقیقت پسندانہ اظہار ملتا ہے ۔انھوں نے زندگی کی تلخ حقائق اور سچائیوں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ان کے افسانوں میں ا تفاقات ہیں زمانے کے،ٹوٹتے دائرے،شاخسانہ، پرتی پھل،سانکل لگادو، بات ایک رات کی، کتنی بلندی کتنی پستی وغرہ قابل ذکر ہیں۔

مختارؔ ٹونکی بنیادی طور پر طنز ومزاح نگار ہیں۔اس لئے اپنی تحریروں میں سماج میں پھیلی برائیوں، بے راہ روی اور کج روی پر طنز کے نشتر چلاتے ہیں۔ساتھ ہی اپنے مزاحیہ انداز سے اپنی تحریروں میں مضحک پہلوں کو بھی بیان کرتے ہیں۔افسانہ''شاخسانہ''، میں افسانہ نگار نے اچھو کی ذہنی کیفیت کو مضحک انداز میں اس طرح بیان کیا ہے:۔

''یہ مالک الموت بھی بڑا ستم ظریف ہے جب لوگوں کی روح قبض کرنے پر آتا ہیتو وقت بے وقت درجنوں کو اپنا شکار کر بیٹھتا ہے اور ہفتوں ایسی سلسلے کو جاری رکھتا ہے،بعض دفعہ تو اسے راتوں کو بھی قبریں کھودنا پڑی ہیں اور اب دیکھو پندرہ دن سے لا پتہ ہے بہ جانے کہاں ڈیوٹی انجام دے رہا ہے،اور یہ نہیں سوچتا کہ یہاں کیسی کی جان پر بنی ہوئی ہے۔''

(شاخسانہ۔جمناتٹ۔سہ ماہی مجلّہ۔جلدنمبر۶،شمارہ۱۔ص۶۰۔۶۱)

مختارؔ ٹونکی کے افسانوں سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ ہمارے روزمراہ کی زندگی سے موضوعات اخذ کرتے ہیں۔ان کے کردار ہمیں جاندار معلوم ہوتے ہیں۔مکالموں میں سادہ بیانی ہے تو پورا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ان کے فن کا دائرہ تکمیل کی صورت میں نمایاں نظر آتا ہے۔وہ اپنے افسانوں میں علامتی اور تجریدی انداز نہیں اپناتے ہے بلکہ سیدھے سادے

انداز میں اپنے نظریہ کو واضع کرتے ہیں۔

مختار ٹونکی کے افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم کہ سکتے ہیں کہ ان کے افسانے ہماری روزمرّہ کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات اور مسائل کو بیان کرتے ہیں۔ جو ہمارے معاشرے میں سانس لیتے نظر آتے ہیں اور ہمیں غور وفکر کی داوت دیتے ہیں۔ اپنی ایسی فنّی اور فکری صلاحیتوں کے باعث ان کا شمار مستند افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

☆☆☆

سعادت حسن منٹو کی کامیاب فلمی زندگی کا سفر

ڈاکٹر محمد نظام الدین
Mob: 9718048854
E-mail: nizamindia9@gmail.com

فطری طور پر دو جگہوں سے انسان کا خاص لگاؤ ہوتا ہے۔ایک اس جگہ سے جہاں وہ جنم لیتا ہے اور دوسرا اس جگہ سے جہاں اسے ملازمت ملتی ہے۔ یہ دونوں مقامات ایسے ہیں جو ہر باضمیر انسان کو آخری سانس تک یاد رہتے ہیں، وہ پوری دنیا میں کہیں بھی چلا جائے ،اس کے دل و دماغ میں کبھی نہ کبھی جائے پیدائش اور جائے ملازمت کی یاد آ ہی جاتی ہے۔اردو کے عظیم افسانہ نگار سعادت حسن منٹو بھی ایسے باضمیر انسانوں میں ہیں جن کے خواب وخیال سے ممبئی اور امرتسر نہیں نکل سکے۔امرتسر اور کشمیر سے متعلق منٹو نے جو کچھ فخریہ انداز میں کہا ہے اس پر بات چیت کبھی اور، آج کی گفتگو کا محور صرف اور صرف منٹو کا پسندیدہ شہر ممبئی اور فلم ہے۔

روزِ اول سے ہی ممبئی پر کشش اور جاذبِ نظر رہی ہے۔اس کی چمک دمک اور فلک بوس عمارتیں سب کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ وہاں نہ صرف زندگی کی آسائش اور راحت کے تمام سامان میسر ہیں بلکہ تابناک مستقبل بنانے کے تمام مواقع اور پلیٹ فارم بھی موجود ہیں۔اسی بنا پر ممبئی جانا اور اپنے کیئر کو بہتر بنانا ہر طالب علم کا اولین خواب ہوتا ہے۔ دورانِ تعلیم سے ہی منٹو کے دل و دماغ میں البیلی اور کافر ممبئی سرایت کر گئی تھی۔ وہاں جانے کی ان کی دلی خواہش تھی لیکن کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ یہ خواہش جنون اور دیوانگی کی حد تک تھی۔دل کی تسلی کے لئے ایک بار وہ گھر چھوڑ کر بمبئی چلے بھی گئے لیکن یہ فرار ان کے حق میں نیک شگوں ثابت نہیں ہوا۔اس کے

باوجود انہوں نے ہمت نہیں ہاری بلکہ ان کے جنون اور شوق میں دن بہ دن اضافہ ہوتا گیا۔ آخر کار منٹو کی قسمت نے یاوری کی اور ہفتہ وار 'مصور' کے مالک نذیر لدھیانوی نے انہیں ممبئی آنے کی دعوت دی۔ اس طرح نذیر لدھیانوی کے توسط سے فلم نگری ممبئی میں منٹو کا داخلہ ہوا۔

شروعاتی دور میں منٹو نے 'مصور' میں ۶۰ روپئے ماہانہ پر ملازمت کی۔ ممبئی میں قیام کے لئے یہ ملازمت ان کے لئے کارآمد ثابت ہوئی۔ مصور میں تمام طرح کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ ہیروں، ہیروئنوں اور دائریکٹروں کی خبروں کے علاوہ تازہ افسانے اور تبصرے بھی چھپتے تھے۔ منٹو نے اپنی بے باک تحریروں اور تبصروں سے فلمی صحافت میں ایک اہم مقام بنالیا۔ انہیں فلمی تحریروں اور تبصروں کے سبب فلم اسٹار اور ڈائریکٹر سعادت حسن منٹو کے نام واقف ہوئے۔ 'مصور' منٹو کی فلمی زندگی کے لئے مفید ثابت ہوا۔ اسی رسالہ کی بدولت منٹو کی رسائی اس وقت کے مشہور صحافی اور فلم نقاد بابو بھائی پٹیل تک ہوئی۔ بابو بھائی فلم سازی کے میدان میں قدم رکھنے کا عزم کررہے تھے۔ اسی دوران منٹو نے ان کے لئے ایک کہانی کا اردو میں ترجمہ کیا۔ بابو بھائی کو وہ ترجمہ بہت پسند آیا۔ جس کے بعد منٹو کی قسمت کھل گئی۔ وہ اس وقت کی مشہور فلم کمپنی 'امپیریل فلمز' میں منشی کی حیثیت سے وابستہ ہوگئے، جہاں انہوں نے مکالمہ نویسی میں اپنی صلاحیت کا جوہر بکھیرا۔ امپیریل فلمز کے مالک اردیشر ایرانی تھے جنہوں نے پہلی بولتی فلم 'عالم آراء' بنائی۔ اور اردیشر ایرانی ہی ہندوستان میں بولتی فلم کے بانی تسلیم کیے جاتے ہیں۔

امپیریل فلم کمپنی میں منٹو کو چالیس روپئے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی جس سے منٹو خوش نہیں تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے ۱۹۳۸ء میں اس کمپنی کو چھوڑ دیا۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک ہفت روزہ 'سماج' میں مدیر کی حیثیت سے کام کیا پھر اسے بھی چھوڑ کر دوبارہ مصور سے وابستہ ہوگئے جہاں وہ ۱۹۴۰ء تک رہے۔ منٹو چونکہ مستقل مزاج نہیں تھے، اس بنا پر وہ ایک جگہ پر زیادہ نوں تک نہیں ٹھہر پاتے تھے۔ ممبئی میں قیام کے دوران کئی اخبارات اور فلم کمپنیوں میں نوکری کی۔ اخباروں میں مدیر، کالم نگار اور فلمی صحافی کی حیثیت سے تو فلم کمپنیوں میں منظر نویس، مکالمہ نویس، فیچر نویس اور

ڈراما نویس کی حیثیت سے منسلک رہے۔ان میں اہم 'فلم سٹی، سرون مووی ٹون فلم کمپنی، ہندوستان سنے ٹون کمپنی، فیمس پکچرز لمیٹیڈ، فلمستان لمیٹیڈ اور ممبئی ٹاکیز لمیٹیڈ وغیرہ ہیں، جس میں ۱۹۴۷ء تک ملازمت کی۔ممبئی ٹاکیز لمیٹیڈ میں منٹو کی تنخواہ ماہانہ آٹھ سو روپے تھی۔کمپنی میں ان کی بڑی عزت اور توقیر تھی۔کمپنی وابستہ تمام افراد منٹو کی صلاحیت اور استعداد کے قائل تھے۔

اس دوران منٹو نے بے شمار فلمی کہانیاں، منظر نامے اور مکالمے لکھے جن میں سے چند قابل ذکر یہ ہیں: کیچڑ (مڈ) اور بنجارہ (کرشن چندر کے ہمراہ)، کسان کنیا، مجھے پاپی کہو، چل چل رے نوجوان، بیگم، نوکر، شکاری، گھمنڈ، آغوش، تو بڑا کہ میں بڑا، اسٹیل، پڑوسن، آٹھ دن اور مرزا غالب۔ 'آٹھ دن' میں منٹو نے ایک پاگل فوجی کا رول بھی ادا کیا تھا۔ 'مرزا غالب' فلم کی اسکرپٹ منٹو نے لکھی تھی، اسکرپٹ ابھی ختم ہی ہوئی تھی کہ ممبئی میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔حالات دن بہ دن دگرگوں ہوتے گئے۔ روزافزوں ناسازگار ماحول کو دیکھ کر منٹو بدگمان ہو گئے اور پاکستان ہجرت کرنے کا قصد کر لیا اور ایک دن ممبئی چھوڑ کر پاکستان چلے گئے۔منٹو کے پاکستان جانے کے بعد سہراب مودی نے راجندر سنگھ بیدی سے مکالمے لکھوا کر فلم بنائی جو باکس آفس پر ہٹ رہی اور اسے بہترین فلم کا قومی ایوارڈ بھی ملا۔

دلبراشتہ ہو کر منٹو پاکستان تو چلے گئے مگر مرتے دم تک ممبئی ان کے دل و دماغ میں گردش کرتی رہی۔ پاکستان جانے کے بعد منٹو کو وہ مقام نہیں ملا جس کا خواب لے کر وہ وہاں گئے تھے۔ معقول تنخواہ اور مناسب ملازمت کی خاطر در در بھٹکے لیکن کہیں تسلی بخش ملازمت نہ مل سکی۔اسی وجہ سے وہ ممبئی کو یاد کرتے اور کہتے کہ میں چلتا پھرتا ممبئی ہوں۔اپنی موت سے تقریباً چار سال قبل منٹو نے ایک مضمون 'جیبِ کفن' نام سے لکھا جس میں منٹو کا درد اور ممبئی کے تئیں بے پناہ لگاؤ کا اندازہ ہوتا ہے۔مضمون سے ایک اقتباس یہاں نقل کیا جا رہا ہے، یہ اقتباس گرچہ طویل ہے لیکن منٹو کے اضطراب اور کسک کو جاننے کے لئے ناگزیر ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

'' آج میرا دل بہت افسردہ ہے۔ایک عجیب سا اضمحلال اس پر چھایا ہوا ہے۔ چار

ساڑھے چار برس پہلے جب میں نے اپنے دوسرے وطن بمبئی کو خیر باد کہی تھی تو میرا دل اسی طرح مغموم تھا۔ مجھے وہ جگہ چھوڑنے کا صدمہ تھا۔ جہاں میں نے اپنی زندگی کے بڑے پر مشقت دن گذارے تھے۔اس خطۂ زمین نے مجھ ایسے آوارہ اور خاندان کے دھتکارے ہوئے انسان کو اپنے دامن میں جگہ دی تھی۔اس نے مجھ سے کہا تھا،تم یہاں دو پیسے روزانہ پر بھی خوش رہ سکتے ہو اور دس ہزار روپئے روزانہ پر بھی۔اگر تم چاہو،تو دونوں صورتوں میں دنیا کے مغموم ترین انسان کی زندگی بسر کر سکتے ہو۔یہاں تم جو چاہو کرو،تمہاری عیب جوئی کوئی نہیں کرے گا۔یہاں تمہیں کوئی ناصح بھی نہیں ملے گا۔ہر کٹھن کام تمہیں خود کرنا ہوگا۔اپنی زندگی کا ہر اہم فیصلہ تمہیں خود ہی کرنا پڑے گا۔تم فٹ پاتھ پر رہو۔یا کسی عالیشان محل میں۔اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔تم جاؤ یا رہو۔مجھے اس سے کوئی فرق محسوس نہیں ہوگا۔میں جہاں ہوں موجود ہوں،موجود رہوں گی۔

یہاں بارہ برس رہنے کے بعد جو کچھ میں نے سیکھا، یہ اسی کا باعث ہے کہ میں یہاں پاکستان میں موجود ہوں۔ یہاں سے کہیں اور چلا گیا تو وہاں بھی موجود رہوں گا۔ میں چلتا پھرتا بمبئی ہوں۔ جہاں بھی قیام کروں گا، وہیں میرا اپنا جہاں آباد ہو جائے گا۔

بمبئی چھوڑنے کے بعد میں افسردہ تھا۔میرے وہاں دوست تھے۔جن کی دوستی پر مجھے ناز ہے۔وہاں میری شادی ہوئی۔وہیں میرا بچہ ہوا۔دوسرے نے بھی اپنی زندگی کا پہلا دن وہیں شروع کیا۔میں نے وہاں چند روپیوں سے لے کر ہزاروں اور لاکھوں تک کمائے اور چرخ کیے۔ مجھے اس سے محبت تھی اور آج بھی ہے۔''

☆☆☆

تصورِ روایت، محمد حسن عسکری کی نظر میں

ڈاکٹر شمیم اختر

9891937153

محمد حسن عسکری ایک نمایاں مقام و مرتبہ کے حامل ادیب ہیں۔ ان کا شمار ایسے ادیبوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی مفکرانہ اور دانشورانہ تحریروں سے اردو ادب میں نئے مباحث کو جنم دیا۔ ان کی ادبی کاوشیں متنوع ہیں، جہاں انہوں نے افسانہ نگاری کو نئی جہت بخشی، وہیں ادب و تنقید کے سلسلہ میں فکری گفتگو کو بھی نئے تناظرات سے آشنا کیا۔ اردو ادب کی تاریخ میں محمد حسن عسکری کی حیثیت اس اعتبار سے مختلف اور اہم ہے کہ انھوں اردو ادب کی فکری سمت نمائی کی سعی کی اور ادب شناسی کے سلسلہ میں نئی جہت کی تعیین کرتے ہوئے اس کے تمام ابعاد و طرق پر فلسفیانہ مباحث کے ذریعہ غور و فکر کے نئے زاویے وا کیے۔ وہ اپنے انداز نظر اور غور و فکر کی اس نئی روش کے سبب اردو ادب میں برابر پہچانے جاتے رہیں گے۔

محمد حسن عسکری نے اپنے ادبی سفر کا آغاز مغرب کے ادبی اور فکری رجحانات و میلانات کے حوالے سے کیا ہے، وہ انگریزی ادب کے متعلم بھی رہے اور معلم بھی، انھوں نے مغربی ادبیات کا گہرائی سے مطالعہ بھی کیا ہے اور مغربی ادباء و شعراء کے افکار و آراء تک پہنچنے کی سعی بھی کی ہے۔ الغرض انھوں نے مغربی افکار و خیالات سے اپنے علم اور اپنی فکر کی شمع روشن کی ہے۔ بقول ان کے ''غالب کی ذہنیت اور میر کی ذہنیت میں کتنا فرق ہے، اس کا مجھے کبھی پتہ نہ چلتا اگر میں مغرب کے ادب سے تھوڑا بہت واقف نہ ہوتا۔ ..... اگر میں نے اردو ادب کے بارے میں کبھی کوئی سمجھ بوجھ کی بات کی ہے تو صرف اسی لئے کہ میں نے مغرب کے لوگوں سے چند امتیازات سیکھے ہیں''۔

محمد حسن عسکری کے یہاں مغربی ادب کو سمجھنے کی شعوری کوشش ضرور ملتی ہے، مگر ان کی تحریروں میں مغربی ناموں کے حوالے یا مغربی تخلیقات سے استناد حاصل کرنے کی کوشش کسی فیشن یا زمانہ کی چلن کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ انھوں نے مغرب کے شعر و ادب اور تہذیب و تمدن کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور مغرب کے مطالعہ سے اپنی فکر کو مہمیز کیا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ انہوں نے مغربی ادب کی وسعت و عظمت کے باوجود اس پر بالکلیہ ایمان بھی نہیں لائے بلکہ اس کا موازنہ اپنے فکری و تہذیبی سرمایہ سے بھی کیا ہے اور رد و قبول کے خراد سے بھی گزرا ہے۔ ان کی تحریریں اس بات پر شاہد ہیں کہ اردو ادب کا جائزہ لینے میں وہ مغربی مصنفین کے ناموں سے نہ تو خود گھبرائے اور نہ مرعوب ہونے کی دعوت دی، بلکہ انھوں ان نقادوں کی سرزنش کی ہے جو مغرب کے فنکاروں کو سمجھے بغیر اور مغرب کے ادب کے مطالعہ کے بغیر اپنی تحریروں میں مغربی فنکاروں اور تخلیقات کا حوالہ دیتے ہیں اور اردو ادب پر سطحی انداز سے مغربی افکار و خیالات اور اصول و ضوابط کو منطبق کرتے ہیں۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں ''ہمارے نقادوں نے ادب کی تاریخوں سے مغربی مصنفوں کے نام نقل کر کر کے ہمارے لکھنے والوں کی تخلیقی تحریک کو میٹھی نیند سلا دیا''۔ محمد حسن عسکری کا خیال ہے کہ مغربی کی تخلیقات اور فنکاروں کو سمجھے بغیر ہم اردو ادب کو مغربی ادب کے درجہ تک نہیں پہنچا سکتے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''ہمیں مغربی ادب کو صرف پڑھنا ہی نہیں بلکہ سمجھنا اور سمجھانا بھی چاہئے۔ صرف مغربی ادب کی تاریخیں الٹنے پلٹنے سے کام نہیں چلے گا۔ بلکہ انفرادی طور سے مغربی مصنفوں کا مطالعہ ہونا چاہئے۔ مطالعہ صرف ان کے ''فلسفہ حیات'' کا نہیں بلکہ ان کے ادبی طریقہ کار کا.....مغربی

ادب کے دو ایک موضوعات نقل کر کے ہم سمجھ
بیٹھے کہ ہم بھی ان لوگوں کے برابر ہو گئے۔ دیکھنے
کی چیز یہ ہے کہ ادبی اور جمالیاتی اصول ٹھوس
شکل کس طرح اختیار کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا
فریضہ ہے جس سے ہماری تنقید دامن بچائے گی
تو ہمارا ادب وہیں کا وہیں رہے گا جہاں آج ہے''
(محمد حسن عسکری، تنقید کا فریضہ (موجودہ حالات
میں)، مجموعہ محمد حسن عسکری، سنگ میل پبلی کیشنز،
لاہور-2008، ص:265)

مندرجہ بالا اقتباس اس بات پر شاہد ہے کہ محمد حسن عسکری مغربی ادب کے سنجیدہ مطالعہ پر زور دیتے ہیں اور اردو ادب کو عالمی درجہ دلانے کے لیے مغرب کی خوشہ چینی کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ اسی لیے وہ مغربی افکار و خیالات، مغرب کے فنکاروں اور ان کی تخلیقات کو گہرائی و گیرائی سے سمجھنے اور اردو ادب کے مطالعے میں اس سے سند حاصل کرنے کی ضرورت کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں۔ لیکن جب وہ ادبی روایت کے تعلق سے بحث کرتے ہیں تو اس سلسلے میں مغربی فکر کو ناقص قرار دیتے ہیں۔ روایت اور تصور ادب کا صحیح نظریہ کیا ہے؟ اس کا جواب عسکری نے ایک فرانسیسی ادیب و مفکر رینے گینوں کے حوالے سے دیا ہے۔ اس سلسلے میں محمد حسن عسکری کے مضامین 'روایت کیا ہے؟' اور 'اردو ادب کی روایت کیا ہے؟' اہم ہیں۔ ان مضامین میں انھوں نے نہ صرف یہ کہ مغربی تصور روایت کی نفی کی ہے بلکہ روایت کے اصلی مفہوم کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اس زاویہ سے اردو ادب و تنقید کو ایک مضبوط بنیاد بھی فراہم کی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''روایتی ادب اور روایتی فنون صرف روایتی
معاشرے میں پیدا ہوسکتے ہیں اور روایتی معاشرہ
وہ ہے جو مابعدالطبعیات کی بنیاد پر قائم ہو۔ مابعد
الطبعیات چند نظریوں کا نام نہیں التوحید واحد۔ ما
بعد الطبعیات صرف ایک ہی ہوسکتی ہے، یہی
اصلی اور بنیادی روایت ہے۔ اس کا تعلق کسی نسل
یا ملک سے نہیں البتہ اس کے اظہار کے طریقے
مختلف ہوتے ہیں اور ہندو روایت یا چینی روایت
یا اسلامی روایت میں فرق انہیں طریقوں کے
اختلاف سے پیدا ہوتا ہے'' (محمد حسن عسکری،
روایت کیا ہے، مجموعہ محمد حسن عسکری، سنگ میل
پبلی کیشنز، لاہور-2008، ص:639)

محمد حسن عسکری کا خیال ہے کہ چونکہ مغرب میں روایت کا بنیادی تصور نہیں ہے، اسی وجہ سے مغرب میں ہر چیز کی روایت جداگانہ تصور کی جاتی ہے، مثلاً معاشرتی روایت، ادبی روایت، مذہب کی روایت، کھیل کود اور سیر و تفریح کی روایت وغیرہ۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر مغرب میں مرکزی روایت کے تعلق سے بحث ہوتی بھی ہے تو معاشرتی روایت کو بنیادی اور مرکزی روایت قرار دیا جاتا ہے جو کہ رسم رواج اور رہن سہن تک محدود ہے، اس روایت کا انحصار چونکہ کسی آسمانی کتاب پر نہیں ہے اس لیے یہ بدلتی رہتی ہے۔ اسی وجہ سے ان کا خیال ہے کہ روایت کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ جو ادب پارہ پرانا ہوجائے اور ماضی کی داستان بن جائے اسے روایت کا نام دے دیا جائے۔ وہ روایت کو صرف ماضی کے کامیاب تجربوں کا نام بھی نہیں دینا چاہتے اور نہ ہی

روایت کو ہمیشہ بدلتی رہنے والی چیز تصور کرتے ہیں۔ان کے خیال میں روایت صرف ایک ہے یعنی دین و مذہب اور وہ بنیادی اور مرکزی روایت ہے، اور بقیہ روایتیں مثلاً معاشرتی روایت، ادبی روایت وغیرہ سب اسی مرکزی روایت کا ہی حصہ ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ ''معاشرتی روایت، ادبی روایت، دینی روایت یہ الگ الگ چیزیں نہیں بلکہ ایک بڑی اور واحد روایت ہے جو سب کی بنیاد ہے اور باقی چھوٹی چھوٹی روایتیں اسی کا حصہ ہیں اور اسی سے نکلی ہیں۔ اسلامی اصطلاح کے مطابق اسی بنیادی روایت کا نام ''دین'' ہے''۔ گویا روایت سے متعلق محمد حسن عسکری کا بنیادی رویہ یہ ہے کہ روایت کا تعلق دین سے ہے، اور روایتی شعور سے مراد مذہبی شعور ہے۔ اسی وجہ سے ان کا خیال ہے کہ ہمارے ادبی شعور اور ادبی روایت کا تعلق مذہبی شعور سے ہے جو کہ مرکزی اور بنیادی روایت ہے لہٰذا اسی پس منظر میں تفہیم ادب کی کوشش کرنی چاہئے۔

ادبی روایت کو دین و مذہب سے متعلق قرار دینے کی وجہ سے محمد حسن عسکری کا خیال ہے کہ کہ حالؔی اور شبلؔی نے مغربی افکار سے غذا پا کر ادبی تنقید کے جو ضابطے مقرر کیے اور شعر و ادب کے سلسلہ میں جو اصول پیش کیے اس سے اردو شاعری کو کافی نقصان پہنچا، کیونکہ انھوں نے مغرب کی پیروی میں شاعری کو دین سے الگ کر دیا۔ ان کا خیال ہے کہ ان بزرگوں نے شاعری کی بنیاد جذبات کو قرار دیا اور شعر و ادب کا مقصد اخلاقی اصولوں کی ترویج ٹھہرایا۔ حالانکہ دین میں سب سے پہلی چیز عقیدہ ہے، اس کے بعد عبادات اور پھر اخلاقی اصول آتے ہیں۔

ان کا خیال ہے کہ چونکہ مغرب میں مذہب کے زوال کے سبب عقائد کی اہمیت بالکل ختم ہو گئی تھی اور عبادات کو مغرب نے رسم و رواج کا نام دے دیا تھا، چنانچہ مغرب نے اخلاقیات کو مذہب کا بدل سمجھ لیا اور اسی کی ترویج و تبلیغ کو مذہب کا مقصد قرار دیا اور مذہب کے تعلق سے انہیں خیالات کو مغرب نے شعر و ادب پر بھی عائد کر دیا۔ چنانچہ حالؔی و شبلؔی نے مغرب کے ان خیالات کو دانشمندی کا جوہر سمجھتے ہوئے اردو شعر و ادب پر اطلاق کر دیا اور یہ بات نظر انداز کر دی کہ اسلام میں

دین محض جذبہ اور اخلاق کا نام نہیں ہے۔اس طور پر حالی وشبلی نے اردو شاعری کو دین سے الگ کر کے ادبی شعور کو نقصان پہنچایا، چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''مگر شبلی مرحوم اور حالی مرحوم وغیرہ پر انگریزوں کی ایسی ہیبت طاری ہوئی تھی کہ انگریزی ادب سے ابتدائی واقفیت کے بغیر انیسویں صدی کی انگریزی تنقید سے دوچار چلتے ہوئے خیالات اخذ کر لئے، اور اپنے ادب کو ان محدود تصورات میں اس طرح مقید کیا کہ آنے والی نسلوں کے ادبی فہم اور ادبی ذوق کو غارت کر گئے'' (محمد حسن عسکری، اردو ادب کی روایت کیا ہے، مجموعہ محمد حسن عسکری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور - 2008، ص:651)

اس زاویہ سے محمد حسن عسکری مشرق ومغرب میں فرق محسوس کرتے ہیں اور مغربی افکار و نظریات کی عظمت کو تسلیم کرنے کے باوجود مغربی افکار کی روشنی میں اردو شعر وادب کی تفہیم کو ناکافی تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے شاعری سے متعلق افلاطون اور ارسطو کے نظریہ نقل سے متعلق بحث کی ہے جس کو مغربی افکار میں اساسیات کا درجہ حاصل ہے۔ افلاطون شاعری کو رد کرتا ہے کیونکہ اس کے خیال میں حقیقت تک رسائی ممکن نہیں اور ارسطو شاعری کو قبول کرتا ہے کیونکہ اس کا خیال ہے کہ شاعری کے ذریعہ حقیقت کی نقالی ممکن ہے۔ گویا ان مفکرین کے نزدیک بنیادی مسئلہ حقیقت تک رسائی کا ہے۔عسکری کا خیال ہے کہ افلاطون، ارسطو اور دیگر یونانی فلسفیوں کے نزدیک حقیقت عظمی کا جو تصور ہے وہ اسلامی تصور حقیقت کے مغایر

ہے۔ کیونکہ یونانی فلاسفہ حقیقت کے وجود کو موجودات میں شمار کرتے ہیں جو عقل وفہم میں سما سکے جبکہ اسلامی فلسفہ میں حقیقت عظمی کا وجود ان معنوں میں نہیں ہے جن معنوں میں یونانی فلاسفہ استعمال کرتے ہیں۔ اسلامی فلسفہ حقیقت کے وجود کو تسلیم کرتا ہے مگر اس طور پر کہ ''واجب جل شانہ کی ماہیت اپنی خودی سے موجود ہے''۔ گویا یونانی فلسفہ کے مطابق حقیقت موجود ہے، اس کی نقل کی جاسکتی ہے لیکن اسلامی تصور کے مطابق حقیقت کا وجود انسانی فہم سے بالاتر ہے، وہ اس طور پر موجود اور معدوم نہیں جس طور پر انسانی عقل وفہم ادراک کرتا ہے، لہٰذا اس کی نقالی بھی ممکن نہیں، البتہ اس کی جانب اشارے کیے جاسکتے ہیں۔

چونکہ یونانی فلسفہ شعر وادب کو حقیقت کی نقل قرار دیتا ہے اور اسلامی فلسفہ نقل کی بجائے صرف اشارہ کہتا ہے، لہٰذا ثابت ہوا کہ دونوں کے نظریہ شعر میں بُعد ہے۔ اس وجہ سے محمد حسن عسکری اردو شاعری کی تفہیم اس کی اپنی تہذیب وروایت کی روشنی میں کرنا چاہتے ہیں نہ کہ مغربی افکار ونظریات کے تناظر میں۔ چنانچہ وہ شاعری کے سلسلہ میں افلاطون اور ارسطو کے نظریہ نقل کو ناقص قرار دیتے ہوئے اردو ادب کی تفہیم میں اس کو مفید تصور نہیں کرتے۔ محمد حسن عسکری اسلامی عقیدہ کے مطابق حقیقت کے تصور کو مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے واضح کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> ''جب اسلام کا تصور حقیقت یہ ہے اور اسلامی شاعری کا فریضہ یہ ہے کہ اس حقیقت کی معرفت حاصل کرنے میں اپنی بساط بھر انسان کی مدد کرے تو پھر ارسطو کے ادبی نظریات ہماری شاعری کو سمجھنے میں کیسے مفید ہو سکتے ہیں؟'' (محمد حسن عسکری، اردو ادب کی روایت کیا ہے، مجموعہ محمد حسن عسکری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔

2008،ص:649)

اس طرح محمد حسن عسکری نے مغربی تصور حقیقت کی بیخ کنی کی جس نے ہماری ادبی، فکری اور روحانی منظر نامے پر تسلط جما لیا تھا۔عسکری نے مغربی بنیادوں کو نہایت ذمہ داری، اعتماد اور یقین سے چیلنج کیا ہے۔ مذکورہ بالا اقتباسات سے محمد حسن عسکری کے نظام فکر میں اسلامی افکار ونظریات کی بازگشت صاف سنائی دیتی ہے، اور یہ بھی کہ ان کا ذہن مغرب کا ضرور ہے مگر دل میں مشرقیت موجزن ہے۔

عام خیال یہ کہ محمد حسن عسکری کو اپنی عمر کے اخیر حصے میں اپنی روایت اور اپنی تہذیب کا احساس ہوا اور وہ شعر وادب کی تفہیم روایت وتہذیب کی روشنی میں کرنے کو ضروری سمجھنے لگے۔ چنانچہ وہ اپنی اس فکری رُخ کے سبب اسلامی ادب کے علمبر دار ہوئے، اور انھوں نے مغربیت کی بجائے مشرقیت کی اہمیت پر زور دیا۔اس ضمن میں بعض ناقدین اس غلط فہمی کا شکار ہوئے کہ محمد حسن عسکری کے یہاں اپنی روایت کا شعور اس وقت رونما ہوا جب وہ ایک عمر ادب کی خاک چھاننے کے بعد مذہب اور عقیدے کی طرف آئے۔

یہ درست ہے کہ اپنی عمر کے اخیر حصہ میں محمد حسن عسکری کی فکر اس بات پر زیادہ مرتکز رہی کہ ہر ادب کی اپنی ایک روایت ہوتی ہے، اور اس کا رشتہ اپنی تہذیب و وراثت سے ہوتا، لہٰذا اس کی ترسیل وتفہیم بھی اسی پس منظر میں ہونی چاہئے، اس زاویے سے مشرقیت اور اسلام کی اہمیت کا شدید احساس ان کو عمر کے آخری چند برسوں میں زیادہ نمایاں اور باضابطہ طریقے سے ہوا، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے عناصر شروع ہی سے ان کی تحریروں میں موجود ہیں۔ چنانچہ اپنے پہلے تنقیدی مجموعہ کے مضمون 'انسان اور آدمی' کے اخیر میں انھوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اس بات پر شاہد ہیں کہ انہیں اسلامی تصور حیات کی اہمیت کا احساس شروع ہی سے تھا۔

''اسلامی کردار کی تخلیق بیسویں صدی کی انسانی

تہذیب میں انقلابی واقعہ ہوگا۔ یہ بات ہمارے
لیے ایک اور لحاظ سے بھی اہم ہے۔ دوسری قومیں
شاید اپنا تصور حیات چھوڑ کر بھی بری بھلی طرح
زندہ رہ سکتی ہیں لیکن ہمارا تصور حیات اتنا واضح،
معین اور غیر مبہم ہے کہ مسلمان صرف اپنے تصور
حیات پر عمل کر کے ہی زندہ رہ سکتا ہے اس کے
بغیر مسلمان کی زندگی ناممکن ہے۔ ہماری قومی
زندگی کی نشو ونما اسی تصور حیات سے وابستہ ہے۔
ہمارے ادب میں بھی اسی طریقے سے جان
آسکتی ہے'' (محمد حسن عسکری، انسان اور آدمی،
مجموعہ محمد حسن عسکری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔
2008، ص:54)۔

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ محمد حسن عسکری کو ابتدا ہی سے اپنی روایت اور اپنی تہذیبی شناخت کا احساس تھا اور وہ شروع سے ہی اسلامی ادب کے علمبردار تھے۔ البتہ محمد حسن عسکری کی اس فکر پر ایک اعتراض ضرور ہوتا ہے کہ یہ مان بھی لیا جائے کہ ہر ادب کی اپنی روایت ہوتی ہے اور چونکہ بنیادی روایت دین و مذہب ہے، لہٰذا ادب کا رشتہ اپنے دین و مذہب سے ہوتا ہے، تو یہ کیا ضروری ہے کہ مذہب سے صرف مذہب اسلام مراد لیا جائے اور ادبی تفہیم اسلامی روایت کی روشنی ہی میں کی جائے؟

اس ضمن میں محمد حسن عسکری کا خیال ہے کہ تمام مذاہب وادیان کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے مقابلہ میں اسلام وہ تنہا مذہب ہے جو عام آدمی کی شخصیت کے متضاد پہلوؤں سے گھبرایا نہیں

اور نہ ہی ان سے آنکھیں چرانے کی کوشش کی بلکہ اسلام نے انسان کے ہر تقاضے کو اس کی واجب جگہ دی ہے۔ اسی وجہ سے وہ کہتے ہیں کہ بیسویں صدی میں یہ اہم کارنامہ ہوگا کہ اسلامی کردار کی تخلیق کی جائے اور شعبہ ہائے زندگی کے تمام شعبوں میں اسلامی تصور حیات سے غذا فراہم کی جائے، کیونکہ اسی تصور حیات سے ہماری قومی زندگی کی نشو ممکن ہے، اور ادب میں بھی اسی طریقے سے جان آ سکتی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''کسی تعصب یا جانبداری کے بغیر یہ کہنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ عام آدمی کی شخصیت، اس کی صلاحیتوں اور اس کی زندگی کے گوناگوں تقاضوں کا جتنا لحاظ اسلام نے رکھا ہے اتنا کسی اور مذہب یا نظام حیات نے نہیں رکھا۔ اسلام نے دل خوش کن باتوں سے کہیں زیادہ اصلی زندگی کی حقیقتوں کی طرف توجہ کی ہے'' (محمد حسن عسکری، انسان اور آدمی، مجموعہ محمد حسن عسکری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور-2008، ص:53)۔

الغرض یہ محمد حسن عسکری کی فکری مساعی کا ایک اہم حصہ ہے کہ وہ اردو ادب کی روایت کو مضبوط بنیاد فراہم کرنا چاہتے ہیں اور اسے مغربی نظریات کے بجائے مشرقی تصورات کی روشنی میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ محمد حسن عسکری کا شمار ایسے ادیبوں میں ہوتا ہے جنہوں نے ادبی روایت کی بحث کے علاوہ ادب و تنقید کے دوسرے نت نئے مباحث کو موضوع گفتگو بنا کر قارئین کو غور و فکر کی دعوت دی ہے، اور اس طور پر شعر و ادب کی تفہیم کے سلسلہ میں اپنی نئی راہ نکالنے کی کوشش کی ہے۔

☆☆☆

مہاتما گاندھی: تعلیمی، مذہبی نقطہ نظر اور ہم آہنگی

ڈاکٹر شیریں فاطمہ
حق مینشن بھٹ جی گھاٹ پاٹن پول
کوٹہ (راجستھان)

ملخص

زبان اظہارِ خیال کرنے اور ایک دوسرے کی بات سمجھنے، سمجھانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ زبان وہ ہے جو زبان ذدِ عام ہو۔ جس کی شیرینی رس گھولتی ہو۔ زبان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اچھی زبان انسان کی عزّت بڑھاتی ہے۔ اس کی شخصیت کی پہچان کراتی ہے۔ سماج اور معاشرے کو بولنے کے آداب سکھاتی ہے۔ برعکس اس کے بری اور بھدّی زبان انسان کو ذلّت اور رسوائی دلاتی ہے۔ لہذا اس مقابلے میں ہر کوئی چاہتا ہے کہ وہ اچھی زبان بولے۔ صاف ستھری زبان بولے۔ دل کو اچھی لگنے والی زبان بولے۔ اور سب سے اچھی زبان وہ ہے جو اس کے گھر میں بولی جاتی ہے۔ عام طور پر گھر پر بولی جانے والی زبان ہی بچّے کی مادری زبان ہوتی ہے۔ جسے وہ سنتا ہے اور بولتا ہے۔ یہی زبان اس کے ذہنی نشو ونما میں مددگار رہوتی ہیں۔

گاندھی جی نے ابتدائی تعلیمی نظام کو مصنوعی اور نا قابلِ عمل سمجھا۔ کیوں کہ اس سے زندگی کے حقیقی مسائل کے ادراک میں مدد نہیں ملتی تھی۔ اور نہ ہی بچّے کو اس کے ماحول سے جوڑنے میں مدد ملتی تھی۔ اس میں معلومات کو غیر فعال طور پر حاصل کیا جاتا تھا۔ گاندھی جی کا خیال تھا کی وسیع نقطہ نظر، رواداری اور اچھّے پڑوسی پن کی خصوصیات کو فروغ دینا چاہیے۔ تعلیم کا ہدف

ریاضی،لکھنا، پڑھنا،اور سیکھنا نہیں ہے۔

گاندھی جی بنیادی تعلیم میں تعلیم کا بہترین ذریعہ مادری زبان کو مانتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ ملکی زبان کے ذریعے ہی ملک کی تہذیب وادب خوشحال ہوں گے۔اور مختلف طبقوں کے لوگوں میں بھائی چارگی بڑھے گی۔ان کا ماننا تھا کے بنیادی تعلیم کا ذریعہ مادری زبان اور اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ملکی زبان ہونا چاہیے۔ہ سچّائی اور عدم تشدد کو زندگی کا حتمی مقصد سمجھتے تھے۔اسی سچّے عدم تشدد کی طاقت پر انہوں نے صدیوں کی غلامی سے ہندوستان کو آزادی دلائی۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

کروڑوں لوگوں کو اپنے پیچھے چلنے کی تلقین کرنے والے کوئی اور نہیں موہن داس کرم چند گاندھی تھے۔جنہیں ہندوستان میں باپو اور دنیا میں مہاتما گاندھی کے نام سے جانا جاتا ہے۔گاندھی جی ۲ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو کاٹھیاواڑ ،پور بندر گجرات میں ایک وشیہ خاندان میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کرم چند گاندھی اور والدہ پتلی بائی تھیں۔ان کی والدہ انتہائی مذہبی خاتون تھی ۔کسی بھی شخص کے شخصیت کی تعمیر اس کے بچپن میں ملی تہذیب پر منحصر کرتی ہے۔گاندھی جی کے شخصیت کی تعمیر میں ان کی والدہ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

سن ۱۸۸۸ء میں وہ قانون کا مطالعہ کرنے کی غرض سے انگلینڈ گئے۔وہ ایک ہونہار طالبِ علم تھے۔ایک وکیل کی حیثیت سے وہ عوام کے لئے انصاف حاصل کرنا اور زیادہ تر بحثوں میں آپسی معاہدے اور تعاون سے کام لینا صحیح سمجھتے تھے۔۱۸۹۱ء میں وہ بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے وطن لوٹ آئے۔

جلد ہی گاندھی جی کو وکالت کے سلسلے میں جنوبی افریقہ جانا پڑا۔یہاں پر انہیں کچھ ایسے تجربے ہوئے جس سے ان کو ہندوستان کے صورتِ حال معلوم ہوئے۔اس سے انہیں جدّ وجہد کرنے کا حوصلہ ملا۔افریقہ میں قیام کے دوران انہوں نے ایک مدرّس،ڈاکٹر اور ایک مدیر کے طور پر کام کیا۔اور یہیں سے ان کی آشرمی زندگی کا آغاز ہوا۔یہ آشرمی زندگی اس وقت شروع ہوکر

آخر تک دکھائی دیتی ہے۔ گاندھی جی جنوبی افریقہ میں ۲۰ سال تک رہے۔ ان ۲۰ سالوں میں وہ افریقہ میں مقیم ہندوستانیوں اور کالے لوگوں کو ان کے انسانی حقوق دلوانے کی جدّ وجہد کرتے رہے۔ انہوں نے ہر ایک جبر کا سختی سے مقابلہ کیا۔ کسی بھی حالت میں معاہدہ کرنے سے انکار کر دیا ۔یہیں پر انہوں نے ہندو، مسلم، سکھّوں میں بنیادی اتحاد کو ضم کیا۔ انہوں نے سمجھ لیا کے سبھی مذاہب کا مقصد ایک ہی ہے۔

سن ۱۹۰۱ء میں وہ ہندوستان لوٹ آئے۔ اسی سال انہوں نے کلکتہ میں کانگریس سیشن میں اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا۔ سیاسی رہنماؤں سے بات کی، جلد ہی ان کے سیاسی اثر ورسوخ میں اضافہ ہوا۔ اور ان کو ملک کا اعلیٰ ترین رہنماء سمجھا جانے لگا۔ دریں اثنا وہ پھر ایک بار افریقہ گئے۔ اور چند سالوں بعد لوٹ کر پوری طرح وہ سیاست میں ڈوب گئے۔ ۲۵ مئی ۱۹۱۴ء کو انہوں نے احمد آباد میں ستیہ گرہ آشرم قائم کیا۔ اور اس کے بعد ہندوستانی سیاست کی ڈور سمبھالی۔

سن ۱۹۲۰ء انہوں نے ''مشہور عدم تعاون کی تحریک'' چلائی۔ ۱۹۳۰ء میں انہوں نے ''سول نافرمانی کی تحریک'' شروع کی اور نمک بنا کر ''نمک قانون'' توڑا۔ حالانکہ گاندھی جی کے 'اروِن معاہدے'' کے بعد یہ تحریک ملتوی کر دی گئی۔ سن ۱۹۴۲ء میں ''بھارت چھوڑو'' کی تجویز پیش کی گئی۔ اور گاندھی جی کو جیل جانا پڑا۔ جیل میں انہوں نے ۲۱ دن کے روزے رکھے۔ ۱۹۴۷ء میں کانگریس کی کوششوں سے ملک کو آزادی ملی۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۷ء تک ہندوستانی قومی تحریک کے دور کو گاندھی عہد کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس دور میں ہندوستان میں جو کچھ ہوا اس کی قیادت گاندھی جی نے کی تھی۔

ہندوستان کو آزادی کی روشنی دکھانے والا یہ سورج آزادی حاصل ہونے کے چند مہینوں بعد ہی غروب ہو گیا۔ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو 'ناتھورام گوڈسے' نامی ایک ہندو بنیاد پرست نے گاندھی جی کا قتل کر دیا۔ مرتے وقت گاندھی جی کے منہ سے ..... ہے رام! لفظ نکلے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گاندھی جی کی تمام عمر ایک ہندو مہاتما کی حیثیت سے گزری۔ ہمارا مقصد یہاں

گاندھی جی کی حالاتِ زندگی پر بحث کرنا نہیں بلکہ ان کے تعلیمی نقطہ نظر کو جاننا ہے۔

گاندھی جی کا تعلیمی نقطہ نظر: تعلیم کے سلسلے میں گاندھی جی کا خیال بالکل واضح تھا، وہ کہتے تھے ''تعلیم سے میرا مطلب ہے کہ نوازائیدہ اور انسان میں بہترین جسم، ضمیر اور روح کا ہمہ جہت اظہار ہے۔ خواندگی تعلیم کا مقصد نہیں۔ انہوں نے برطانوی حکومت کے زیرِ انتظام چلائی گئی ''ابتدائی تعلیم اسکیم'' پر تنقید کی۔ ان کی نظر میں تعلیم کا مقصد خود انحصاری ہے۔ تعلیم کے ذریعے ہر ایک بچے میں مکمل طور پر خود انحصار ہونے کی اہلیت ہونی چاہیے۔

اس خود انحصاری میں روزی کمانے کی صلاحیت بھی شامل ہے۔ گاندھی جی کے لفظوں میں ''تعلیم بے روزگاری کے خلاف ایک قسم کی انشورینس ہونی چاہیے''۔ اس لئے گاندھی جی نے اپنی 'بنیادی تعلیم اسکیم' میں صنعت کے ذریعے تعلیم اور بنیادی تعلیم کے طریقۂ کار پر زور دیا ہے۔ روسو کی طرح گاندھی جی نے بھی تعلیم کو بچوں کی مرکزیت سمجھا ہے۔ ان کے الفاظ میں ''حقیقی تعلیم وہ ہے جو بچوں کی روحانی، فکری اور جسمانی طاقتوں کی حوصلہ افزائی کرتی رہے''۔ اس طرح تعلیم کا ہدف ہمہ جہت ترقی کرنا ہے۔ اس میں بچوں کے دماغ کے ساتھ ساتھ اس کے جسم اور روح کی بھی مکمل ترقی ہوتی ہے۔ گاندھی جی تعلیم کو کردار نگاری کی بنیاد سمجھتے تھے۔

تعلیم کے ذریعے طالبِ علم میں عدم تشدد اور جمہوری خصوصیات کو فروغ دینا چاہیے۔ گاندھی جی نے ابتدائی تعلیمی نظام کو مصنوعی اور نا قابلِ عمل سمجھا۔ کیوں کہ اس سے زندگی کے حقیقی مسائل کے ادراک میں مدد نہیں ملتی تھی۔ اور نہ ہی بچّے کو اس کے ماحول سے جوڑنے میں مدد ملتی تھی۔ اس میں معلومات کو غیر فعال طور پر حاصل کیا جاتا تھا۔ گاندھی جی کا خیال تھا کی وسیع نقطہ نظر، رواداری اور اچھّے پڑوسی پن کی خصوصیات کو فروغ دینا چاہیے۔ تعلیم کا ہدف ریاضی، لکھنا، پڑھنا، اور سیکھنا نہیں ہے۔

گاندھی جی پر ٹالسٹائے کا بھی بہت اثر تھا۔ انہوں نے ۲۵ مئی ۱۹۱۵ء کو احمد آباد کے سابرمتی کے کنارے 'ستیہ گرہ آشرم' کے ساتھ ایک اسکول بھی قائم کیا۔ یہ اسکول ان کے تعلیمی

نظریات کے لئے لیبارٹری بن گیا اوراس سے گاندھیائی تعلیم کا نمونہ پیش ہوا۔سن۱۹۳۲ء تک گاندھی جی کے تعلیمی نظریات بہت پختہ ہو چکے تھے۔

گجراتی میں لکھی ان کی تصنیف ''ستیہ گرہ سمرنوں اتیہاس'' میں ان کے افکار کو وسیع پیمانے پر بیان کیا گیا ہے۔گاندھی جی بنیادی تعلیم میں تعلیم کا بہترین ذریعہ مادری زبان کو مانتے تھے۔ان کا کہنا تھا کہ ''ہمیں اپنی مادری زبان پر اسی طرح قائم رہنا چاہئے جس طرح میں اپنی ماں سے چمٹ جاتا ہوں''۔

گاندھی جی تعلیم کے ذریعے کے طور پر انگریزی کے سخت خلاف تھے۔اس سلسلے میں انہوں نے کہا'' آج جب ہمارے پاس مفت اور لازمی ابتدائی تعلیم شروع کرنے کا ذریعہ نہیں ہے تو ہم انگریزی پڑھنے کے انتظامات کیسے کر سکتے ہیں ۔روس نے انگریزی کے بغیر اپنا تمام سائنسی کام کیا، یہ ہماری ذہنی نفسیات ہے جو ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم انگریزی کے بغیر کام نہیں کر سکتے۔

ان کا خیال تھا کہ ملکی زبان کے ذریعے ہی ملک کی تہذیب و ادب خوشحال ہوں گے۔اور مختلف طبقوں کے لوگوں میں بھائی چارگی بڑھے گی۔ان کا ماننا تھا کے بنیادی تعلیم کا ذریعہ مادری زبان اور اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ملکی زبان ہونا چاہیے۔

ان کا ماننا تھا کہ بچّوں پر انگریزی مسلط کرنا ان کی فطری نشو ونما اور ممکنہ طور پر ان کی اصلیت کو ختم کرنا ہے۔ان کے تعلیمی فلسفے کا مقصد ایک نیا معاشرہ قائم کرنا تھا،لیکن ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ انہوں نے انفرادی ترقی سے زیادہ معاشرتی ترقی پر زور دیا۔یہ صحیح ہے کہ بطور سیاسی رہنما ان کی نظر سماجی تنظیموں پر تھی۔لیکن ان کی تعلیم کا مقصد معاشرے کی ترقی سے زیادہ انفرادی ترقی تھا۔وہ ایک مثالی جمہوریت میں مناسب تعلیمی نظام کا انتظام کرنا چاہتے تھے۔

اگر چہ آج کے حالات اس کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتے اور موجودہ دور میں ان کو اپنایا نہیں جا سکتا،تو اس سے گاندھی جی کے تعلیمی فلسفے کی اہمیت کسی بھی طرح کم نہیں ہوتی۔انہوں نے

ان تمام موضوعات پر اپنے بنیادی نظریات پیش کئے ہیں جن میں خواتین کی تعلیم ،اساتذہ کے لئے ضروری خصوصیات ،اہداف اور تعلیم کے ذرائع شامل ہیں گاندھی جی ہندوستان اور ہندوستانی ثقافت کو بہت گہرائی سے سمجھتے تھے۔گاندھی جی کے بارے میں جتنا بھی کہا جائے کم ہے۔وہ سچّائی اور عدم تشدد کو زندگی کا حتمی مقصد سمجھتے تھے۔اسی سچّے عدم تشدد کی طاقت پر انہوں نے صدیوں کی غلامی سے ہندوستان کو آزادی دلائی۔ان کی زندگی کے نہ جانے کتنے ایسے واقعات ہیں جن سے ان کے اصولوں اور نظریات کی تصدیق ہوتی ہے۔

گاندھی جی کے تعلیمی مقصد مطالعہ کے بعد، ہم اپنے اصل مقصد کے بارے میں بات کرتے ہیں۔آزادی کے بعد جب تقسیمِ ہند کی بات شروع ہوئی تو گاندھی جی بہت افسردہ ہوئے۔وہ تقسیم نہیں چاہتے تھے۔لیکن حالات ایسے بن چکے تھے کہ تقسیم ہو کر رہی۔افسوس کی بات یہ تھی کہ گاندھی جو سمجھنے میں ہندو اور مسلمان دونوں سے بھول ہوئی۔گاندھی جی دونوں تنظیموں کی جنونیت کو پسند نہیں کرتے تھے۔پاکستان بننے پر وہ پاکستان کی مالی مدد کرنا چاہتے تھے۔لیکن بنیاد پسند ہندوؤں نے اس پالیسی کی مخالفت کی۔

ہندومت کے پیروکار ہونے کے باوجود گاندھی جی تمام مذاہب کا احترام کرتے تھے۔ انہوں نے تمام مذاہب کو مساوات کی نظر سے دیکھا۔اور انکی دی گئی تعلیمات کو اپنی زندگی میں اپنایا۔گاندھی جی نے تقریباً تمام مذاہب جیسے ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، بدھ، جین، وغیرہ مذہبی متن کا مطالعہ کیا۔

گاندھی جی کا مذہبی نقطہ نظر: گاندھی جی نے مذاہب کے سلسلے میں جو نظریات پیش کئے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

ا۔مہاتما گاندھی اور ہندو مذہب: جدید ہندوستان کی قومی بیداری میں گاندھی جی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔وہ خود کو ایک سناتنی ہندو کہتے تھے۔وہ خدمت کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے ۔ان کا ماننا تھا کہ اخلاقیات اور خوبیوں سے مالا مال ہندو مذہب انسان کو فلاح و بہبود کا راستہ دکھاتا

ہے۔ ہندو مذہب کا اصل اور دنیا کا سب سے قدیم متن وید میں جوانوکھا علم ہے،ایک ''سدو بپرا بہودھا بدنتی'' ہے جس کا معنی ہے حقیقت (سچ) ایک ہی ہے جس کا علماء نے متعدد طریقوں سے بیان کیا ہے۔''وسودھیو کٹمبکم سروے بھونتو سکھنہ'' کے احساس کے ساتھ ہی انسان خوشی اور سکون سے رہ سکتا ہے۔گاندھی جی یہ اچھی طرح سمجھتے تھے۔''ہندو مذہب کا وقار حق اور عدم تشدد پر منحصر ہے۔اور ہندو مذہب کسی بھی مذہب کا مخالف ہو ہی نہیں سکتا''۔(**ہریجن سیوک ۲۸/۳/۲۵**)

ہندو مذہب کے معنی ہے زندگی میں دین پر عمل کرنا، نہ کہ دوسروں کی تبلیغ کرنا۔ وہ ہمیشہ یہی دعا کرتے تھے کہ ''ویشنو جن تو تے نے کہیئے جے پیر پرائی جانے رے''،لہذا ویشنو اور ہندو وہ ہے جو دوسرے کی تکلیف کو سمجھے۔اس دعا سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہندو مذہب صرف ہندوستان کے لئے نہیں بلکہ انسانیت کو امن وسکوں بخشنے والا مذہب ہے۔

گروکل میں سن ۱۹۲۵ء میں تقریر کرتے ہوئے گاندھی جی نے کہا تھا کہ ''میں ہندو مذہب سے پوری طرح مطمئن ہوں''۔ یہ اتنا وسیع ہے کہ یہ ہر طرح کے عقاید کو پناہ دیتا ہے۔سن ۱۹۲۰ء میں شانتی نکیتن میں تقریر کرتے ہوئے گاندھی جی نے کہا کہ ''ذاتی شکل میں میرے لئے صرف ایک مذہب ہے وہ ہندو ہے۔میں اپنے آپ کو ہندو کہلانے میں فخر محسوس کرتا ہوں۔ جہاں تک میں اس مذہب کو سمجھ پایا ہوں یہ ایک پختہ مذہب ہے۔اس میں رواداری ہے اور یہ دوسرے مذاہب کا احترام کرتا ہے۔میں ہندو اس لیے ہوں کہ ہندو مذہب ہی وہ چیز ہے جو دنیا رہنے کے قابل بناتی ہے۔(**نوجیون ۱/۱۲/۲۶**)

گاندھی جی کے مطابق ہندو''اپنیشدوں اور پرانوں'' کو مقدّس کتابوں کے طور پر قبول کرتا ہے۔ جسے عدم تشدد جیسے پانچ یموں پر یقین ہیا ور جو اپنی بہترین صلاحیت کے ساتھ ان پر عمل کرتا اہے۔ جو روح اور الٰہی میں یقین رکھتا ہے۔اسے یقین ہے کہ روح لازوال ہے۔اور انسانی کوششوں کا مقصد نجات حاصل کرنا ہے۔ ہندو مذہب کے بحران پر گاندھی جی کہتے ہیں۔کہ ہندو مذہب کی پاکیزگی ہندو مذہب کے فلسفے پر مبنی ہے۔ جب ہندو مذہب پر بحران آتا ہے تو اس کے

بعد ہندو مذہبی برائی کا سبب ڈھونڈھتا ہے اور اس کا علاج کرتا ہے۔ ہندو مذہب یعنی نہ رکنے والا، آگے بڑھنے والا، سچّائی کی تلاش کی راہ ہے۔ آج یہ مذہب تھکا ہوا سا لگتا ہے۔ آگے بڑھنے کی ترغیب دینے میں معاون ثابت نہیں ہوتا دکھتا، اس کی وجہ ہے ہم تھک گئے ہیں مذہب نہیں۔ جس لمحے ہماری تھکاوٹ دور ہوگی اس لمحے ہندو مذہب میں ایسا دھما کا ہوگا۔ جیسے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ ہندو مذہب اپنے اثر اور رسوخ سے دنیا میں چمک اٹھیگا۔ ہندو مذہب قدیم مثبت فکر انگیز انداز میں عدم تشدد کے ذریعے پوری دنیا کو امن کی راہ دکھا سکتا ہے۔

گاندھی جی عدم تشدد کے ذریعے ہی آزادی حاصل کر سکے۔ کیوں کہ ہندو لوگ عدم تشدد کے اصول کو سمجھتے ہیں۔ اور اپنی زندگی میں با قاعدگی کے ساتھ اس کا استعمال کرتے ہیں۔ لہذا انہوں نے گاندھی جی کی مکمل حمایت کی۔ اگر گاندھی جی کی پیدائش کسی دوسرے ملک میں ہوتی تو ان کے پاس یہ عدم تشدد غالب خیالات نہیں ہوتے۔ خواہ ہوتے بھی تو ان کو کوئی تعاون حاصل نہیں ہوتا۔ ہندوستان نے ہزاروں سالوں سے پوری دنیا میں سچّائی، عدم تشدد اور امن کا پیغام دیا ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ہندو مذہب کی عدم موجودگی میں انسانی تہذیب نے ایک الگ ہی شکل اختیار کر لی ہوتی اور دنیا تیسری عالمی جنگ میں پھنس کر ختم ہوگئی ہوتی۔

۲۔ مہاتما گاندھی اور دینِ اسلام: دینِ اسلام کی تعلیمات آسان ہیں۔ منافقین اور اندھے عقائد کے لئے دینِ اسلام میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اسلام میں شرک، مورتی پوجا، پروہتواد وغیرہ کی مخالفت کی گئی ہے۔ اس میں ایک ہی خدا کی عبادت پر زور دیا گیا ہے۔ ابتدا میں اندھا اعتماد، برائیاں اور بدانتظامی پھیلی ہوئی تھی۔ ایسی صورتِ حال میں حضرت محمد ﷺ نیا سلام کی آسان تعلیمات پیش کی تو لوگ دینِ اسلام سے بہت متاثر ہوئے۔ لہٰذا اسلام لی آسان تعلیمات کی وجہ سیدینِ اسلام خوب پھیلا۔

ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کے مطابق 'اسلام ایک سرشار اور آفاقی مذہب ہے۔ جو اپنے پیروکاروں کے ساتھ یکساں سلوک کرتا ہے۔ یعنی سب کو برابر سمجھتا ہے'۔ (The spoke

Ambedker "part-Bhagwandas page no.144-145)

گاندھی جی کے مطابق ''اسلام اپنے عظیم عہد میں بھی قدامت پسند نہیں تھا۔ بلکہ پوری دنیا اسکی تعریف کر رہی تھی۔اس وقت جب مغربی دنیا میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا مشرقی افق پر ایک روشن ستارا چمکا۔جسنے حیرت زدہ دنیا میں روشنی اور امن قائم کیا۔اسلام کوئی جھوتا مذہب نہیں ہے۔ ہندوؤں کو بھی اس کا مطالعہ اسی طرح کرنا چاہئے جیسے میں نے کیا۔تب پھر وہ بھی میری ہی طرح اس سے محبت کرنے لگیں گے۔

میں پیغمبرِ اسلام ﷺ کی سوانح حیات کا مطالعہ کر رہا تھا جب میں نے کتاب کا دوسرا حصّہ بھی مکمّل پڑھ لیا تو مجھے افسوس ہوا کہ میرے پاس اس عظیم الشان شخصیت کا مطالعہ کرنے کے لئے مزید کتابیں نہیں تھیں۔اب مجھے پہلے سے زیادہ یقین ہے کہ یہ تلوار کی طاقت نہیں تھی جانے اسلام کے لئے والمی سرزمین فتح کی بلکہ یہ پیغمبرِ اسلام ﷺ کی نہایت سادہ زندگی،عہد اور انکی تعلیمات تھی۔ یہ آپ ﷺ کا اپنے پیروکاروں اور دوستوں سے محبت کرنا اور خدا پر یقین تھا۔ یہ تلوار کی طاقت نہیں تھی بلکہ وہ خصوصیات اور خوبیاں تھی جن سے ساری رکاوٹیں دور ہو گئیں اور آپ ﷺ نے تمام مشکلات پر فتح حاصل کر لی۔**(جگت مہرشی،ص-۲)**

گاندھی جی نے سن ۱۹۳۷ء میں رسالہ ''ہریجن'' میں لکھا تھا ''اگر سوراج مل جاتا ہے تو ہم ملکی نظام حضرت عمرؓ (دوسرے خلیفہ) کی خلافت کی طرز پر چلائیں گے۔ کیوں کہ حضرت عمرؓ کے نافذ کردہ اسلامی شریعت کے قانون کے مطابق پیشگوئی کے قوانین مسلمان اور غیر مسلم دونون پر یکساں طور پر لاگو ہوں گے۔مسلمان کا سامان غیر مسلم چرائے یا غیر مسلم کا مسلمان چرائے دونوں کو یکساں سزا ملے گی۔شراب بنانے اور فروخت کرنے کی صورت میں سزا کے حقدار صرف مسلمان ہوں گے۔سود اور اس کا کاروبار سب کے لئے جرم ہوگا۔شراب کی طرح سے ہی سور پالنے،اس کا گوشت فروخت کرنے اور کھانے پر کسی غیر مسلم کو نہیں روکا جائے گا۔ یہاں تک کے اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کے سور یا شراب کو نقصان پہنچاتا ہے تو اس سے اس سامان کا معاوضہ فراہم

کروایا جائے گا۔

گاندھی جی نے ۱۹۳۷ء میں اپنی ایک تقریر میں سادگی سے زندگی گزارنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ ''میں رام چندر جی اور کرشن جی کا حوالہ نہیں دے سکتا ہوں کیوں کہ وہ تاریخی شخصیات نہیں ہیں، میں مجبور ہوں سادگی کے لئے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کا نام پیش کروں گا وہ بہت بڑی سلطنت کے حاکم تھے لیکن انہوں نے سادگی سے زندگی گزاری۔

Gandhi in his statement in the "Tej"dated 5th October (1925)

اسلام پر مہاتما گاندھی کے خیال تھے کہ ''یوروپ والے جنوبی افریقہ میں اسلام کی تشہید سے خوفزدہ ہیں اس اسلام سے جس نے اسپین کو مہذب کیا۔اس اسلام سے جس نے مراکش تک روشنی پہنچائی اور دنیا کو اخوّت کی انجیل پڑھائی۔جنوبی افریقہ کے یوروپی اسلام کے پھیلاؤ سے صرف اس لئے خوفزدا ہیں کیوں کہ ان کے پیروکار گوروں کے ساتھ یکسانیت کی مانگ نہ کر بیٹھے۔ اگر ایسا ہے تو انکا ڈرنا ٹھیک ہے۔اگر اخوّت ایک گناہ ہے اور اگر کالی نسلوں کی گوروں سے برابری ہی وہ چیز ہے جس سے وہ ڈر رہے ہیں تو پھر اسلام کی تشہید سے ان کے ڈرنے کی وجہ سمجھ میں آجاتی ہے۔**(پروفیسر کے۔ایس راما کرشناراؤ کی مدھور سندیش سنگم، دہلی میں شائع کتاب ''اسلام کے پیغمبر محمد ﷺ میں، صفحہ نمبر ۱۳)**

گاندھی جی کے مطابق اسلام میں سبھی مسلمان برابر ہیں اور آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ دینِ اسلام میں بلاتفریق ہر شخص کے معاشرتی اور معاشی حقوق کو برابر سمجھا جاتا ہے۔اس مذہب میں ذات پات اور اونچ نیچ کے نام پر تفریق بھی نہیں ہوتی۔لہذا دوسرے مذاہب کے لوگ برابری کی عزّت پانے کی نظر سے اسلام قبول کر لیتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ دینِ اسلام ان ممالک میں بھی پھیلا جہاں معاشرتی عدم مساوات موجود تھیں۔

۳۔مہاتما گاندھی اور عیسائی مذہب؛عسائی مذہب دنیا کا سب سے بڑا مذہب ہے۔عیسائیت کے

پیروکار ہر ملک میں پائے جاتے ہیں یہ یوروپ اور امیریکہ کے تمام ممالک کا اصل مذہب ہے۔حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات بہت آسان تھی۔ان کی تعلیمات میں تماشوں ، مذہبی رسموں اور منافقین کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ان کا بنیادی مقصد انسانی فلاح اور بہبود تھا۔لہٰذا حضرت عیسیٰؑ کی آسان تعلیمات لوگوں کو جلد سمجھ میں آجاتی تھی۔اس وجہ سے بھی ہزاروں لوگ عیسائی مذہب کے پیروکار بن گئے۔

بہت سی دینی کتابوں ، مذاہب اور مغربی فلسفیوں کے خیالات نے گاندھی جی کے افکار کو متاثر کیا۔عیسائی صحیفوں میں ' نیوٹیسٹا نمینت'او'رسمر وآن دی ماوئنٹ' نے گاندھی جی کے افکار پر گہرا اثر ڈالا۔عدم تشدد کی مذاحمت کی تعلیم انہیں عیسیٰؑ مسیح کے ان الفاظ سے ملی،''خدا انہیں معاف کردے کیوں کے وہ نہیں جانتے وہ کیا کرر ہے ہیں۔

تین جدید عیسائی فلسفی جان رسکن ،ہینری دیوڈ تھوروا اور ٹالسٹائے نے گاندھی جی کو بہت متاثر کیا۔ جان رسکن کی تصنیف''ان ٹو دِس لاسٹ'' سے دستی مزدوری کا احترام سیکھا اس معاشی نظام پر غور کیا جس سے ہر ایک کو فائدہ ملتا ہو۔گاندھی جی تھورو کی سول نافرمانی سے متاثر ہوئے۔ٹالسٹائے کے اثر ورسوخ میں گاندھی جی نے عیسائیت کی اخلاقی انتشار کا نظریہ اپنایا۔اس کے''اشور کا سامراجیہ اپنے اندر ہے''، کے عنوان کے مضمون کو پڑھنے کے بعد گاندھی جی کے شک وشبہات دور ہو گئیا ورعدم تشدد پر ان کا اعتماد اور مضبوط ہو گیا۔ٹالسٹائے نے محبت کو سبھی مسائل کا حل سمجھا۔اس کا کہنا تھا''عیسائی اپنے پڑوسی کے ساتھ جھگڑا نہیں کرتے نہ ہی اس پر حملہ کرتے ہیں۔اور نہ ہی تشدد کا استعمال کرتے ہیں۔

ہمیں یہ جان کر حیرت ہولیکن خود فلسفہ اور روحانیت کے بارے میں گاندھی جی کا تجسّس افریقہ میں عیسائیوں کی صحبت میں پیدا ہوا تھا۔اس کے بارے میں انہوں نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ''میں تو سفر کرنے کاٹھیاواڑ کی سازشوں سے بچنے اور معاش حاصل کرنے کے لئے جنوبی افریقہ گیا تھا،لیکن پڑ گیا خدا کی تلاش میں ،خود شناسی کے حصول میں ،عیسائی بھائیوں نے

میرے تجسّس کو اور بڑھا دیا۔ وہ کسی بھی طرح کم ہونے والی نہیں تھی، میں خاموش بھی رہنا چاہتا تو بھی عیسائی بھائی بہن مجھے خاموش نہیں رہنے دیتے۔ لیکن جب ایک بار روحانیت اور خود شناسی کے بارے میں تجسّس سامنے آجاتا ہے تو کسی مذہب، برادری اور صحیفے میں مندھ کر نہیں رہ پاتا۔ یہی گاندھی جی کے ساتھ ہوا۔

۳۔مہاتما گاندھی اور بدھ مذہب: گاندھی جی پر ہمیشہ یہ الزام لگایا جاتا تھا کہ وہ سناتن ہندو مذہب کی آڑ میں بدھ مذہب کو فروغ دے رہے ہیں۔ جب کہ ان کا ماننا تھا کہ بدھ نے صرف ہندو مذہب کو بڑھایا ہے۔ جب گاندھی جی نے بدھ کو اپنی سادہ اور فرّاخ نظر کے ساتھ سے دیکھا تو انہوں نے پایا کہ بدھ نے واقعی ویدک فکر کے دھارے کو تقویت بخش اور بہتر بنانے کا کام کیا ہے۔ علم کی روایت میں اسی طرح تو نئے علم کی نشو ونما ہوتی ہے۔ ہر نئی نسل پرانی سوچ کی اچّھی اور منطقی باتوں کو قبول کرتی ہیا ور لمبے عرصے میں جو برائیاں اس میں آتی ہیں انہیں دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بدھ نے بھی ایسا ہی کیا۔

شری لنکا کے بدھسٹوں سے خطاب کرتے ہوئے گاندھی جی نے کہا کہ ''میں پختہ یقین رکھتا ہوں کہ بدھ مذہب یا کہئے بدھ کی تعلیمات ہندوستان میں خوب پروان چڑھی۔ بدھ مذہب سے واقف لوگ یہ جانتے ہیں کہ بدھ نے ویدک رسومات، اندھے اعتماد اور جانوروں کی قربانی جیسی پرتشدد حماقتوں سے نجات دلانا چاہا۔ لیکن ان کی زبان آج کے رجعت پسندوں کی زبان نہیں تھی۔ ان کی زبان صرف محبت، شفقت اور ہمدردی کی عکّاسی کرتی ہے۔ گوتم بدھ نے اپنے زمانے میں خدا کے نام پر چلنے والی بری چیزوں کو مسترد کر دیا تھا۔ گاندھی جی کے مطابق بدھ مذہب ترک، قربانی، عدم تشدد اور محبت کا پیغام دیتا ہے۔ بدھ عظیم مبلّغین میں سے ایک تھے۔

۴۔مہاتما گاندھی اور جین مذہب: عدم تشدد کا عالمی دن ۲ اکتوبر مہاتما گاندھی جی کو ی یوم پیدائش کو وقف کیا گیا ہے۔ آج پوری دنیا کے لئے مہاتما گاندھیا وران کا عدم تشدد ایک مثال ہے۔ جبکہ گاندھی جی کی زندگی اور ان کے افکار پر جین کا مت کا اثر واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ مہاویر سے لے

کر مہاتما تک اور مہاتما سے لے کر اب تک جین مت اور عدم تشدد نے عالمی امن میں انوکھا تعاون کیا ہے۔

جہاں تک ہم عالمی تاریخ کو دیکھتے ہیں تشدد-انتقام کا وحشیانہ شیطانی چکّر نظر آتا ہے۔مہاویر سوامی کے زمانے میں تشدد اپنے عروج پر تھا۔کمزوروں،خواتین اور جانوروں پر ظلم ہو رہے تھے۔مذہب کے نام پر منافقت پھیلی ہوئی تھی۔ایسے وقت میں مہاویر سوامی نے تپسیہ سے علم حاصل کیا۔اور صرف اسی علم سے دہکتی ہوئی زمین کو راحت بخشی۔جین مت کے آخری تیرتھنکر مہاویر سوامی کے زیرِ اثر سینکڑوں سالوں تک عدم تشدد اور امن کا راج رہا۔ستیہ گرہ اور عدم تشدد کا نظریہ گاندھی جی نے جین مت سے حاصل کیا۔سچّائی اور عدم تشدد کا سیاسی استعمال کر کے گاندھی جی نے جین مت کو بلندی عطا کی ہے۔

مذہبی ہم آہنگی: ہندوستان کی آزادی کی جدّ وجہد کو اسی دن سمت مل گئی تھی جس دن گاندھی جی ۱۹۱۵ء میں جنوبی افریقہ سے لوٹے تھے۔اور اپنے سیاسی گرو گوپال کرشن گوکھلے کے مشورے پر پہلے ہندوستان کا دورہ کیا۔پھر ۱۹۱۹ء میں بہار کے چمپارن کی سرزمین پر تحریک کا آغاز کیا۔لیکن یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ گاندھی جینہ تو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کے جشنِ آزادی میں شامل ہوئے اور نہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو اپنے شاگرد پنڈت جواہر لال نہرو کی تاریخی تقریر میں شرکت کی۔ایسے میں سوال یہ اٹھتا ہے کہ ملک کی آزادی کے لئے اپنا سب کچھ ترک کرنے والے گاندھی جی کیوں ملک کی اتنی بڑی کامیابی سے دور رہے۔اور اس وقت وہ تھے کہاں؟

دراصل بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ہندوستان کی تقسیم کی بنیاد پر ملی آزادی گاندھی جی کو منظور نہیں تھی۔یہ وجہ تھی کہ جب پورا ملک آزادی کا جشن منا رہا تھا اس وقت گاندھی جی بنگال میں فسادات کی آگ بجھا رہے تھے۔ہندو اور مسلمان کے درمیان ہم آہنگی قائم کرنے کے لیے گاندھی جی گاؤں گاؤں گھوم رہے تھے۔ان کے پاس دینی کتابیں ہی تھی انہوں نے تمام ہندوؤں اور مسلمانوں سے امن برقرار رکھنے کی اپیل کی۔اور ان سے حلف لیا کہ وہ ایک دوسرے کا قتل نہیں

کریں گے۔

یہاں اس واقعے کو بیان کرنے کا میرا مقصد یہی ہے کہ گاندھی جی کے مذہبی نقطہ نظر کے مطابق ان کے دل میں تمام مذاہب ذاتوں کے ساتھ ساتھ انسانوں کے لئے محبت کا احساس تھا۔اور گاندھی جی کے زمانے سے لے کر آج تک بھی ہندوستان میں مذہبی علیحدگی اور تنازعات چل رہے ہیں ۔گاندھی جی اس مذہبی علیحدگی اور محاذ آرائی کو ختم کرنا چاہتے تھے۔اور ہندوستانی معاشرے میں مذہبی ہم آہنگی قائم کرنا چاہتے تھے۔

ماحصل: گاندھی جی کے مذہبی نقطہ نظر اور ہم آہنگی کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ گاندھی جی ایک سناتنی ہندو پیروکار ہونے کے باوجود ہندوستان میں موجود تمام مذاہب کا احترام کرتے تھے۔انہوں نے تمام مذہبی کتابوں کا مطالعہ کر کے تمام مذاہب کے درمیان ہم آہنگی قائم کرنے کی کوشش کی۔ مذہب اور تنازعات کے اختلافات کو دور کر کے معاشرے میں مذہبی ہم آہنگی قائم کرنے کی کوشش کی۔

☆☆☆

افتخار امام نے نہ صرف ادیب، بلکہ ادب پیدا کیا ہے

(ڈاکٹر سیفی سرونجی)
مدیر سہ ماہی 'انتساب عالمی'
Mob:9425641777

یہ بات طے شدہ ہے کہ دنیا میں کوئی بھی شاعر، ادیب، نقاد رسائل کی اہمیت اور اُن کی خدمات سے انکار نہیں کرسکتا، کہ ہر شاعر، ادیب بڑا انھیں رسائل سے بنتا ہے اس لئے کہ ان ہی رسائل میں چھپنے سے وہ اُس مقام تک پہنچتے ہیں، یوں تو اردو رسائل کی ایک لمبی فہرست ہے جن پر بہت کچھ لکھا جانا چاہئے، مثلاً نگار، فنون، شاہراہ، اوراق، شب خون، ذہنِ جدید، نیا ورق، شمع وغیرہ ۔لیکن اُن رسائل میں ایک رسالہ ایسا ہے جس کا پورا خاندان اُس رسالہ کو زندہ رکھنے کے لئے اتنی قربانیاں دے چکا ہے کہ جس کی تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہوگا، وہ خاندان ہے سیماب اکبرآبادی کا اور وہ رسالہ ہے 'شاعر' جو کہ اشاعت کے ۹۰ برس مکمل کر چکا ہے، اُن ۹۰ برسوں میں خاندانِ سیماب اکبرآبادی نے 'شاعر' کے لئے کیا کچھ نہیں کیا، ۱۹۳۰ء میں آگرہ سے سیماب اکبرآبادی نے اُسے جاری کیا، اور پھر ممبئی سے ایک چھوٹا فلیٹ جس میں ان کی رہائش بھی تھی، اور اس فلیٹ میں 'شاعر' کا آفس بھی ۔۱۹۳۰ء سے لے کر آج تک سیکڑوں اتار چڑھاؤ آئے لیکن 'شاعر' کو خاندان سیماب نے بند نہیں ہونے دیا، یہی نہیں اِن ۹۰ برسوں سے 'شاعر' نے ایسے ایسے ضخیم نمبر شائع کیے ہیں کہ وہ ادبی دنیا میں ایک دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ایک ایک ہزار صفحات پر مشتمل یہ خصوصی شمارے شائع کر 'شاعر' نے ایک رِوایت قائم کی ہے کہ جس کی مثال نہیں ملتی ۔کرشن چندر نمبر، اقبال نمبر، افسانہ نمبر، غالب نمبر اور درجن بھر ضخیم نمبروں کے علاوہ اردو رسائل

کی دنیا میں ایک ایسا رکارڈ قائم کیا ہے کہ ادب کا ایک نایاب ذخیرہ جمع ہو گیا ہے، جب تک اردو زبان زندہ رہے گی لوگ اِس نایاب ذخیرے سے فیض یاب ہوتے رہیں گے، جہاں ایک طرف 'شاعر' کے بانی علامہ سیماب اکبرآبادی نے رسالے کو زندہ رکھنے کے لئے اپنا خون جگر صرف کیا وہیں دوسری طرف اُن کے انتقال کے بعد اعجاز صدیقی نے اپنے والد کی اُس روایت کو قائم رکھنے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا، اُن کا ہر سفر 'شاعر' کے لئے ہوتا تھا، شاعر کے لئے جیتے تھے اور شاعر کے لئے سوچتے تھے، اُسے زندہ رکھنے کے لئے ایسے ایسے لوگوں سے تعلقات بنائے رکھے تھے، جن سے 'شاعر' کو زندہ رکھنے میں مدد ملتی تھی۔ اردو رسائل کی تاریخ اٹھا کر دیکھی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ کسی نے اپنی شہرت کے لئے رسالہ نکالا، کسی نے کوئی سیاسی مفاد حاصل کرنے کے لئے، تو کسی نے اپنے نظریات تھوپنے کے لئے اور کسی نے ترقی پسند تحریک کے لئے، لیکن 'شاعر' کی مثال کوئی پیش نہیں کر سکتا کہ اُس رسالہ نے کبھی کوئی ذاتی مفاد نہیں رکھا اور نہ ہی 'شاعر' کسی گروپ کا رسالہ رہا۔ جہاں ایک طرف رسالے نے درجنوں ترقی پسندوں کو چھاپا، انھیں روشناس کرایا وہیں دوسری طرف جدید شاعروں، ادیبوں کو بھی چھایا اور مابعد جدیدیت والے بھی اِس رسالے میں چھپتے رہے ہیں، ہر سیاسی گروپ بندی سے بے نیاز، ہر چھوٹے بڑے ادیب 'شاعر' کے قدر کو نہیں، بلکہ اچھے تخلیق کاروں کو اپنے پرچے میں جگہ دی۔ سیماب اکبرآبادی سے لے کر افتخار امام صدیقی اور ناظر نعمان صدیقی اب تک اِس روایت پر قائم رہے، آج جبکہ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کا جھگڑا عروج پر ہے، ایسے ماحول میں بھی 'شاعر' نے کسی تحریک، رجحان کو بڑھاوا دینے یا ایک طرف جھکنا گوارا نہیں کیا، ورنہ بڑے بڑے مدیرانِ رسائل اپنا قبلہ بدل چکے ہیں، یہ صرف 'شاعر' کا ہی کمال ہے کہ ادب میں کئی رجحانات آئے، لیکن 'شاعر' نے اپنا رویہ نہیں بدلا، نہ کسی بڑی شخصیت سے مرعوب ہوا نہ کوئی سیاسی فائدہ اٹھایا یہی نہیں، 'شاعر' کا سب سے بڑا کمال یہ بھی ہے کہ دنیا کے تمام اردو پڑھنے والوں کو کھوجنے کے بعد اردو کی نئی بستیوں میں جہاں بھی 'شاعر' کو ایک اردو پڑھا لکھا آدمی نظر آیا وہاں 'شاعر' نے رابطہ قائم کیا اور دبئی، مسقط،، ابوظہبی، لندن، جرمی، چین، ہالینڈ،

پولینڈ وغیرہ جیسے ملکوں میں کوئی بھی اردو کا قاری، شاعر، ادیب ہوا ہے 'شاعر' نے اُسے کھوج نکالا ہے۔

آج اردو کی نئی بستیوں میں جو چہل پہل اردو رسالوں کی نظر آ رہی ہے اُس میں سب سے بڑا رول 'شاعر' کا ہی ہے۔ 'شاعر' سے پہلے لوگ وہاں کے شاعروں، ادیبوں کے نام سے بھی واقف نہ تھے، نہ وہاں کوئی ادبی رسالہ پہنچتا تھا اور نہ ہی اردو کی نئی بستیوں والے ہندوستان کے رسائل سے واقف تھے، ایک تنہا 'شاعر' نے اردو کے فروغ کے لئے، اردو رسائل کی اہمیت کے لئے رسالے کے ذریعے ساری دنیا میں اردو دنیا کے کونے کونے سے لکھنے والوں کو نہ صرف کھوج نکالا ہے، بلکہ 'شاعر' کے کئی شماروں میں مسلسل اداریے لکھے، اپنی ذاتی کوششوں سے ذاتی خرچ پر 'شاعر' کو بھیجا، ان کی تخلیقات کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا اور سارے لکھنے والوں کو ایک دوسرے سے آشنا کیا، ادب سے آشنا کیا۔ 'شاعر' سے منسلک خاندان سیماب کے ایک فرد نے 'شاعر' کے لئے اپنا وقت، اپنا پیسہ اور ساری مصروفیات وقف کرنے کے بعد سارے ادبی پسِ منظر کو عوام کے سامنے کر دیا، حد تو یہ ہے کہ افتخار امام کے بھائی احتشام صدیقی اپنے بیوی بچوں سے دور، اپنی ساری خواہشات کو بالائے طاق رکھ کر سعودی عرب گئے اور 'شاعر' کے لئے قربان ہو گئے۔ دنیا کی تاریخ میں اپنے بزرگوں کی روایت کو قائم رکھنے کے لئے اتنی بڑی قربانی کسی نے نہ دی ہوگی، یہی سب کچھ آج افتخار امام، ناظر نعمان، اور حامد اقبال کر رہے تھے۔

'شاعر' نے کئی ترقی پسندوں، کئی جدیدیوں کو ادبی دنیا میں نہ صرف روشناس کرایا ہے، بلکہ کئی شاعر ادیب جو دنیائے ادب میں جگمگا رہے ہیں وہ 'شاعر' کی ہی دریافت ہے، نام یہاں اس لئے پیش نہیں کر رہا ہوں کہ اُس کی فہرست طویل ہے۔ 'شاعر' کی انھیں قربانیوں کو دیکھتے ہوئے کئی یونیورسٹیز میں الگ الگ موضوعات پر 'شاعر' کی خدمات پر تحقیقی مقالے لکھے جا رہے ہیں اور لکھے جانے چاہئے کہ 'شاعر' نے نہ صرف ادیب، بلکہ ادب پیدا کیا ہے، شاعر نے کئی بدلتے دھاروں کو موڑا ہے، یہ 'شاعر' ہی کی آواز تھی جو آج اردو چینل کا آغاز ہو رہا ہے۔ سب سے پہلے

شاعر نے یہ تجویز رکھی اور جب 'شاعر' کی آواز حکومت کے ایوانوں تک پہنچی تو ساری دنیا کے اردو کو چاہنے والوں کی آواز بن گئی۔ اب وقت آ گیا ہے کہ 'شاعر' کے ۹۰ برس پورے ہونے پر تمام اردو قارئین یہ تحریک چلائیں کہ ہر اردو ادیب کے پاس 'شاعر' آئے ایسا کوئی اسکول کوئی کالج یا یونیورسٹی نہ ہو جہاں 'شاعر' نظر نہ آئے۔

رسائل میں 'شاعر' کے ۹۰ برس مکمل ہونے پر 'شاعر' کو گھر گھر پہنچانے کی ایک تحریک چلائی جائے جہ 'شاعر' زندہ ہے تو ادب زندہ ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت کے تھپیڑے کھاتے کھاتے 'شاعر' آواز دیتا رہ جائے اور ہم علوم وفنون کی اِس عظیم وراثت سے محروم ہو جائیں، اس لئے کہ اردو ادب کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال دیکھنے میں نہیں آئی کہ جس نے اپنے بزرگوں کی ادبی وراثت قائم رکھنے کے لئے پیڑھی در پیڑھی اتنی قربانیاں دی ہوں۔ افسوس! کہ ۹۰ برس تک 'شاعر' کو افتخار امام نے اپنی آخری سانسوں تک زندہ رکھا۔ اللہ کرے افتخار امام کے انتقال کے بعد اُن کے خاندان کے وارثین رسالے کو زندہ رکھ سکیں۔

☆☆☆

آزادی سے قبل اجمیر میں اردو افسانہ

چھوٹولال
اسسٹنٹ پروفیسر،
گورنمنٹ گرلز کالج، پیپلو،
ٹونک (راجستھان)
mob-9829827798

راجستھان میں صوبہ اجمیر وہ علاقہ ہے جہاں سب سے پہلے اردو افسانہ نگاری کی جانب توجہ دی گئی۔ ترقی پسند تحریک کے وجود میں آنے سے پہلے ہی یہاں اردو افسانے لکھے جا رہے تھے۔ نہ صرف لکھے جا رہے تھے بلکہ انگریزی افسانے اردو کا جامع پہن رہے تھے۔ اردو افسانہ نگاری کا یہ سلسلہ سنہ ۴۷ء تک بخیر وخوبی چلا۔ یہاں تخلیق کئے گئے افسانوں میں مختلف موضوعات نظر آتے ہیں۔ بیشتر افسانے رومانی طرز کے ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں جب ترقی پسند تحریک کی ابتدا ہوئی تو اس کے اثرات یہاں کے افسانہ نگاروں نے قبول نہیں کئے۔ بلکہ مذکورہ تحریک شروع ہونے سے قبل ہی یہاں مزدور، سماجی مسائل، اشتراکیت جیسے موضوعات جگہ پا چکے تھے۔ اجمیر کے بیشتر افسانہ نگار ترقی پسند تحریک کے مخالف بھی رہے۔ جن میں قیسی رامپوری، بہار کوٹی، عبید اللہ قدسی اور معین زلفی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ذیل میں اجمیر کے چند افسانہ نگاروں کا مختصر تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

حیدر اجمیری:

حیدر اجمیری جن کا پورا نام سید رفیع الدین حیدر تھا، راجستھان کے اولین افسانہ نگاروں

میں شمار کئے جاتے ہیں۔جنھوں نے ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۵ء کے دوران کئی انگریزی افسانوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ڈاکٹر شاہد جمالی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

'' اجمیر ہی نہیں سارے راجستھان میں بیسویں صدی کی افسانہ نگاری کے سلسلے میں سب سے پہلا نام جے،ایم، رفیع الدین حیدر اجمیری کا ہی آتا ہے۔جنھوں نے ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۵ء کے دوران کئی انگریزی افسانوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ان تاریخوں سے قبل اجمیر ہی نہیں بلکہ راجستھان میں کہیں بھی مطبوعہ اردو افسانے نظر نہیں آتے۔اس لحاظ سے بھی حیدر اجمیری کو بیسویں صدی کا راجستھان میں پہلا افسانہ نگار کہا جا سکتا ہے۔رفیع الدین حیدر اجمیری کے حالات زندگی بہت تلاش وجستجو کے باوجود بھی دستیاب نہیں ہو سکے۔نہ ہی یہ معلوم ہو سکا کہ ان کا وصال کب ہوا تھا۔راقم الحروف کی نظر سے ان کے چند افسانے گزرے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

ولیم (۱۹۲۱ء) (آفتاب، جھالا واڑ)، کیفر کردار (۱۹۲۲ء)، (آفتاب، جھالا واڑ)، شمع دان (۱۹۲۲ء)، (ہزار داستان، لاہور)، روزا (۱۹۲۲ء) (ہزار داستان، لاہور)''

(اجمیر میں اردو افسانہ، ڈاکٹر شاہد احمد جمالی۔راجپوتانہ اردو ریسرچ اکیڈمی، جے پور، ۲۰۲۰ء، ص:۳۵)

حیدر اجمیری کے علاوہ دیگر اہم افسانہ نگاروں میں رفیعی اجمیری، قیسی رامپوری، عبید اللہ قدسی، حبیب اللہ فضائی، معین زلفی، وغیرہ ایسے اہم نام ہیں جنھوں نے اجمیر میں آزادی سے قبل اردو افسانے کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ان میں رفیعی اجمیری کا نام خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے۔

رفیعی اجمیری:

ڈاکٹر شاہد احمد نے رفیعی اجمیری کے تعلق سے لکھا ہے:

''رفیعی اجمیری جن کا اصل نام رفیع الدین صدیقی تھا، ۱۹۰۹ء میں اجمیر میں پیدا ہوئے۔ اور عین عالمِ شباب میں ۱۹۳۹ء میں انتقال کر گئے۔ والد کا نام شیخ سلام الدین تھا۔ اجمیر کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ بچپن سے ہی بہت ذہین تھے۔ مطالعہ کا شوق بہت تھا۔ اردو عربی فارسی انگریزی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ جب انھوں نے جولائی ۱۹۲۷ء میں رسالہ ''کیف'' جاری کیا تو ان کے برادران نے اس کی سخت مخالفت کی تھی، جس کی وجہ سے رفیعی نے فضائی اجمیری اور قیسی رامپوری کو اس کی ذمہ داری سونپ دی تھی۔ صرف تیس سال کی زندگی میں انھوں نے ملک گیر پیمانے پر نہ صرف شہرت حال کی بلکہ اپنی تخلیقات کے ذریعہ مشاہیر ادب کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ اختر شیرانی، ان کے یار غار تھے، مجنوں گورکھپوری، نیاز فتح پوری، غلام رسول مہر، ساغر نظامی جیسی مشہور ادبی شخصیات سے ان کے تعلقات رہے۔ انھوں نے طبع زاد افسانے بھی لکھے، انگریزی ادب سے ترجمہ بھی کئے، اور انگریزی ناولوں کا ترجمہ بھی کیا۔''

(اجمیر میں اردو افسانہ، راجپوتانہ اردو ریسرچ اکیڈمی، جے پور، ۲۰۲۰ء، ص:۳۹)

رفیعی اجمیری کے افسانوں کا ایک ہی مجموعہ ہے جو ''کہکشاں'' کے عنوان سے ان کے انتقال کے بعد ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کو رفیعی کے دوست قیسی رامپوری نے مرتب کیا تھا۔ اس میں تیس افسانے اور چار ادبی مضمون شامل ہیں۔ یہ مجموعہ اب نایاب ہے۔

قیسی رامپوری:

قیسی کا اصلی نام حامد الدین خلیل الزماں خان تھا۔ والد کا نام محمد زمان خان تھا۔ ۲۰ رجون ۱۹۰۸ء کو رامپور میں پیدا ہوئے۔ تلاش معاش میں ۱۹۲۴ء میں اجمیر آ گئے تھے۔ اور اسی شہر کو اپنا

وطن ثانی بنایا تھا۔قیسی نے اپنی ادبی زندگی کی شرعات یہیں کی تھی ۱۹۲۷ء میں انھوں نے پہلا افسانہ''ایثار مجسم''تحریر کیا تھا جو اجمیر سے نکلنے والے ماہنامہ 'کیف' میں شائع ہوا تھا۔۔اس کے بعد انھوں نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔دوسال کے عرصہ میں ہی ملک گیر پیمانے پر انھوں نے شہرت حاصل کی۔

اجمیر کے قیام کے دوران ان کے تین افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔کیفستان۔(۱۹۳۳ء)ضربیں(۱۹۴۴ء)غبار(۱۹۴۴ء)۔

کیفستان، میں تیرہ افسانے،ضربیں، میں گیارہ افسانے اور غبار میں چودہ افسانے شامل ہیں۔لیکن تینوں مجموعوں کے افسانوں کی تعداد سے کہیں زیادہ تعداد میں قیسی رامپوری نے افسانے لکھے ہیں۔ڈاکٹر شاہد جمالی نے قیسی رامپوری کے اُن افسانوں کی ایک فہرست مرتب کی ہے، جو ان کے افسانوی مجموعوں میں شامل نہیں ہیں،ان کے تعداد ۴۹ رہے۔ڈاکٹر جمالی لکھتے ہیں:

> ''ان کے علاوہ بھی قیسی کے اور افسانے ہیں، جو اس فہرست میں شامل نہیں ہیں، یہ فہرست اس جانب بھی اشارہ کرتی ہے کہ قیسی کے تینوں افسانوی مجموعوں میں شامل افسانوں سے کہیں زیادہ تعداد میں ان کے افسانے ہیں۔ان کا پہلا افسانہ جو ۱۹۲۷ء میں لکھا گیا تھا تب سے ۱۹۴۸ء تک کا ان کا افسانوی سفر مانا جا سکتا ہے۔یعنی کم و بیش بیس اکیس سال کا۔ان میں سے بیشتر افسانے اجمیر میں لکھے گئے۔قیسی کے بیشتر افسانوں میں انسانی زندگی اور انسان کے فطرتی جذبات اور پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ان کے افسانے سچے جذبات کی تصویر ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں کو بہترین رومانی افسانوں میں شامل کیا جاتا ہے۔عشق و محبت کی کہانی کے ساتھ ساتھ اس کے نفسیاتی پہلوؤں پر بھی قیسی کی نظر رہتی ہے۔لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ انھوں

نے ہمیشہ ایثار و قربانی کے جذبات کو پیش کیا ہے، جو انسانیت کی معراج مانے جاتے ہیں۔انھوں نے سرمایہ داری پر بھی افسانے لکھے، بلکہ انھوں نے بہت سے کردار سرمایہ دار کردار تخلیق کئے ہیں لیکن بیشتر نے حقداروں کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ پیغام دیا ہے کہ سرمایہ داروں کے پاس جو روپیہ ہے اس پر غریبوں کا بھی حق ہے۔''

(قیسی رامپوری کی افسانہ نگاری:ایک جائزہ۔ڈاکٹر شاہد احمد جمالی،راجپوتانہ اردو ریسرچ اکیڈمی، جے پور۔۲۰۲۱ء۔ص:۲۰۲۔۲۰۳)

قیسی کے افسانوں میں رومان اور ان کی طرز تحریر کا جلوہ سحر انگیزی کی حد تک نظر آتا ہے۔ان کی کہانیاں سماجی زندگی کے روزمرہ محرکات اور تجربات سے معمور ہوتی ہیں۔یہاں تک کہ قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ خود بھی اس کہانی میں کہیں نہ کہیں کھڑا ہوا ہے۔وہ اپنی ذات کو اس کہانی میں دیکھتا اور اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کو مچلتے اور پروان چڑھتے دیکھتا ہے۔اسے اپنی زندگی کی صدائیں بازگشت کرتی محسوس ہوتی ہیں۔ایک سچے افسانہ نگار کے اسلوب کی یہی سب سے نمایاں خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ قاری کو اس حد تک متاثر کردے۔قیسی کے افسانوں میں حسن و عشق اور محبت میں کھو دینے والا پر اثر ماحول ہے اور رومانی دنیا کی فضاؤں میں کھو جانے والے محرکات نظر آتے ہیں۔

محمود الحسن بہارؔ کوٹی:

بہار کوٹی راجستھان کے اہم افسانہ نگار رہے ہیں۔انھوں نے بھی اپنی ادبی زندگی کی ابتدا اجمیر سے کی تھی۔بہارؔ کوٹی کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر شاہد جمالی لکھتے ہیں:

''پورا نام محمود الحسن،ادبی نام بہارؔ کوٹی۔۱۹۰۸ء میں ''کوٹ''،ضلع فتحپور (یو پی) میں پیدا ہوئے۔اسی نسبت سے اپنے آپ کو کوٹی لکھتے رہے۔آپ کی تعلیم و تربیت وہیں ہوئی۔ناگپور اور فیروز پور (پنجاب) جا کر اعلیٰ تعلیم

حاصل کی۔شعر وسخن کا شوق ان کی طبیعت میں تھا، نا مساعد حالات کہیں یا کچھ اور ان کے مقدر میں ترک وطن کرنا لکھا تھا، تلاش معاش کے سلسلے میں ۱۹۲۷ء میں اجمیر چلے آئے۔اجمیر کی آب وہوا اس قدر راس آئی کہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ بہارؔ کو جو کچھ بھی ادبی عزت وشہرت ملی، اجمیر آ کر ہی ملی۔ بہارؔ کو انگریزی، ہندی، اردو اور فارسی پر عبور تھا۔''

(بہا کوٹی: ایک تعارف، ڈاکٹر شاہد احمد جمالی، راجپوتانہ اردو ریسرچ اکیڈمی، جے پور۔۲۰۱۹ء، ص:۸)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''بہارؔ کوٹی کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے اور ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ان کا آبائی وطن قصبہ کوٹ ضلع فتح پور، ہسوہ تھا۔اسی نسبت سے وہ خود کو کوٹی لکھتے تھے۔نسلاً کھوکھر پٹھان تھے۔ پٹھانوں کا یہ قبیلہ راست گوئی اور بے باکی، غیرت مندی و جفاکشی اور مہمان داری و دلنوازی کی جن صفات کے لئے شہرت رکھتا ہے، وہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ ہاں اس قبیلے کی طبیعت، خروش اور الھڑ پن ان میں نہ تھا۔تعلیم اور تخلیقی صلاحیتوں نے ترفّع کے ذریعہ ان چیزوں کو کچھ کا کچھ کر دیا تھا۔''

(ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا مضمون، مشمولہ۔ذات وکائنات۔۱۹۷۷ء۔ص۔آخری صفحہ)

اجمیر میں بہارؔ کو بہت اچھی اور مشہور شخصیات کی صحبت ملی۔ چونکہ اجمیر میں سیماب اکبرآبادی اکثر آتے تھے اور قیسی رامپوری کے گھر پر ٹھہرا کرتے تھے۔ جہاں سیماب کے دیگر تلامذہ جمع ہوتے اور شعری مجلسیں منعقد ہوا کرتی تھی۔میر احدی اجمیری، عبید اللہ قدسی، فضائی، اور سیماب کے دوسرے تلامذہ بھی وہاں ہوا کرتے تھے۔ بہارؔ کوٹی کو سیماب اکبرآبادی سے بھی فیضیاب ہونے کا پورا موقع ملا۔ بہار کوٹی کی افسانہ نگاری کے تعلق سے ڈاکٹر جمالی لکھتے ہیں:

''حیدر اجمیری، رفیع قیسی، الیاس، رضوی، قدسی، فضائی، اثر جلیلی جیسے

مشہور افسانہ نگاروں کے درمیان افسانہ نگاری میں قدم رکھنا اور اپنا مقام حاصل کرنا بہت بڑی کامیابی تھی۔ بہارؔ کے افسانوں کی خصوصیات یہ ہیں کہ نہ وہ ایک دم طویل ہیں (جیسے رفیعی اور قیسی کے افسانے) اور نہ ہی بہت مختصر ہیں۔ان کا طرز تحریر نہایت سادہ اور دلچسپ ہے۔کئی افسانوں پر یہ گمان ہوتا ہے کہ بہار اپنا کوئی واقعہ سنا رہے ہیں۔''

(بہار کوٹی، ایک تعارف۔ص۔۱۶)

بہار کی افسانہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے قیسی رامپوری لکھتے ہیں:

''یہ امر دیانت کے منافی ہوگا، اگر میں یہ نہ کہوں کہ بہارؔ کے افسانے تاثر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔خاص طور پر ان کا پہلا افسانہ ''رکشا والا''۔یہ افسانہ، نہ صرف متاثر کن ہے بلکہ اس میں ایک تڑپا دینے والا طنز بھی ہے۔''قیدی''۔نازش۔اور فرض، وغیرہ اپنی جگہ بے حد اثر انگیز ہیں۔بہارؔ کے افسانوں کی کامیابی کا راز ان کے جذبات کی صداقت ہے۔جس طرح وہ گفتگو اور کردار میں مخلص ہیں، اسی طرح ان کا خلوص افسانوں میں نمایاں ہے۔''

(مقدمہ، قیسی رامپوری، خاکستر، بہار کوٹی، رائل ایجوکیشنل بک ڈپو، دہلی، ۱۹۴۵ء۔ص:۱۱)

''بہار کے افسانوں کو میں واقعاتی اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ان کی کہانیوں کے پلاٹ تخیلی نہیں ہیں۔بلکہ ان میں واقعات کے پلاٹ بنے ہوئے ہیں۔بہار کی زندگی میں حادثے اور سعید اتفاقات گزرے ہیں، لیکن چونکہ وہ حسّاس بہت ہیں اور حسّاسیت کا نتیجہ قنوطیت ہے، اس لئے قنوطیت نے ان کے دل پر حوادث نما واقعات کا نقش قائم کر دیا اور دوسرے نقوش دھندلے کر دئے۔لیکن ان کا ایک افسانہ'' کانٹا'' نے مجھے ضغطہ میں مبتلا

کر دیا ہے، کیوں کہ یہ افسانہ تخیل کی دولت سے مالا مال ہے۔مبالغہ کا افسانہ ساز فن بھی اس میں موجود ہے۔اور تمام تر افسانوی زبان کا بھی مالک ہے۔اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بہارؔ اپنی مشق وعادت کے مطابق حقیقت نگاری کے سلسلے میں اگر تخیلی کردار پیدا کرنا چاہیں تو بہ آسانی کر سکتے ہیں۔اوران کو افسانوی زبان بھی عطا کر سکتے ہیں۔''

(خاکستر،مقدمہ۔قیسی رامپوری۔ص۔۹۔۱۰)

بہار کوٹی کا افسانوی مجموعہ''خاکستر''میں ۱۹/افسانے ہیں اور ۱۹۴۵ء میں خواجہ برقی پریس، دہلی میں چھپا تھا۔اس مجموعے کے علاوہ بھی بہار کوٹی کے کئی افسانے مختلف رسائل میں شائع ہوئے تھے۔

عبید اللہ قدسی:

''۱۹۰۹ء میں ٹونک میں پیدا ہوئے۔آپکے والد مفتی عبداللہ مقبلؔ ٹونک کے عالموں میں سے تھے۔حبیب اللہ فضائی آپ کے بڑے بھائی تھے۔ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کی۔ان کی وفات کے بعد بھوپال چلے گئے جہاں ان کے بڑے بھائی قیام پذیر تھے۔مولوی عالم اور فاضل ادب کے امتحانات الٰہ باد یونیورسٹی سے پاس کئے۔اور مولوی فاضل کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا۔بھوپال میں شاعری کا شوق ہوا تو وہاں ظہیر دہلوی کو اپنا کلام دکھایا۔بعد میں بھائی کی ترغیب پر ۱۹۲۸ء میں سیماب اکبرآبادی کے دامن فیض سے وابستہ ہوگئے۔۱۹۳۰ء میں بیاور کے سناتن ہائی اسکول میں مدرس ہوگئے۔انٹر کالج ہو جانے پر فارسی کے لکچرار ہو گئے۔آپنے بھی نظم اور نثر میں بڑا نام پیدا کیا۔تقسیم ملک کے وقت ترک وطن کر گئے۔بھوپال کے قیام کے دوران ایک تنقیدی رسالہ

''کحل بصیرت'' تصنیف کیا۔ دہلی سے نکلنے والے ہفتہ وار اخبار 'ریاست' میں کئی ماہ تک لکھتے رہے۔ اس کے علاوہ ملک کے کئی مقتدر رسائل میں آپ کے مضامین اور دیگر تخلیقات شائع ہوتی رہیں۔ ۱۹۳۴ء میں ''روح اسلام'' ایک کتاب لکھی۔ ایک اور کتاب ''مشرق میں روح کا تخیل'' کے عنوان سے شروع کی تھی مگر وہ مکمل نہ ہوسکی۔ ''محاکمہ بوموازنہ انیس ودبیر' بھی لکھنا شروع کی تھی مگر وہ بھی انجام تک نہ پہنچ سکی۔''

(راجپوتانہ میں سیماب اکبرآبادی کا سلسلہ تلمذ۔ راجپوتانہ اردو ریسرچ اکیڈمی، جے پور، ۲۰۱۹ء، ص:۹۹)

عبیداللہ قدسی نے کئی افسانے تحریر کئے تھے جو ملک کے مختلف مشہور رسائل میں شائع ہوئے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ قدسی کی کسی بھی تخلیق کا کوئی مجموعہ شائع نہ ہوسکا۔ ڈاکٹر شاہد جمالی نے اپنی کتابوں میں قدسی کے کئی افسانوں کی نشاندہی کی ہے۔ جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ ملکہ جاپان (افسانہ) شاعر۔ آگرہ۔ اگست، ۱۹۴۰ء

۲۔ بزرگوں کی شوخیاں۔ شاعر۔ آگرہ۔ فروری ۱۹۴۱ء

۳۔ نور جہاں۔ (افسانہ) شاہکار۔ لاہور۔ اپریل، ۱۹۳۸ء

۴۔ سفید ڈاڑھی (افسانہ) ''کلیم'' دہلی۔ جولائی ۱۹۳۶ء

۵۔ میرا دوست۔ (افسانہ) عبیداللہ قدسی۔ شاعر، مئی۔ ۱۹۴۶ء

۶۔ عورت کی فطرت۔ (افسانہ)۔ عبیداللہ قدسی۔ شاعر، ستمبر۔ ۱۹۳۸ء

اجمیر کے دیگر افسانہ نگاروں میں، معین زلفی، الیاس رضوی، عرفان فضائی، صدف اجمیری، حیرت اجمیری، وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آزادی سے قبل، اجمیر میں افسانہ نگاری کے سلسلے میں ڈاکٹر شاہد جمالی لکھتے ہیں:

''آزادی سے قبل اجمیر اردو افسانے کا مرکز بنا ہوا تھا۔ یہاں درجن بھر افسانہ نگار موجود تھے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی ترقی پسند تحریک سے متاثر نہیں تھا۔ گو ان کے افسانوں میں

وہ موضوعات بھی شامل رہے جو ترقی پسند تحریک کے پسندیدہ موضوعات رہے۔لیکن زیادہ تر افسانے رومانی اور طنز ومزاح کی روش پر تحریر کئے گئے۔اجمیر کے چند افسانہ نگار ایسے ہیں جنھوں نے بہت کم وقت میں ملکی سطح پر اپنی پہچان بنالی تھی،اور جن کے افسانوی مجموعے شائع ہوکر مقبول خاص وعام ہو چکے تھے۔ان افسانہ نگاروں میں،رفیع اجمیری،قیسی رامپوری،محمود الحسن بہارکوٹی کے نام خصوصیت سے لئے جاسکتے ہیں۔اگر اجمیر کے افسانہ نگاروں کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو،حسب ذیل فہرست تیار ہوتی ہے:

۱۔ رفیع الدین حیدر اجمیری
۲۔ رفیعی اجمیری
۳۔ قیسی رامپوری
۴۔ معین الدین زلفی
۵۔ محمود الحسن بہارکوٹی
۶۔ عبیداللہ قدسی
۷۔ ابوالعرفان فضائی
۸۔ سید الیاس رضوی
۹۔ حیرت اجمیری
۱۰۔ پروفیسر بدرالاسلام
۱۱۔ صدف اجمیری
۱۲۔ مفتوں اجمیری

(اجمیر میں اردو افسانہ،ڈاکٹر شاہد احمد جمالی،راجپوتانہ اردو ریسرچ اکیڈمی،جے پور،۲۰۲۰ء،ص:۳۔۴)

☆☆☆

جموں وکشمیر کی شاعرات وادباً ۔نسائی حسیت کے تناظر میں

ڈاکٹر حارث حمزہ لون
رحمت آباد رفیع آباد،
بارہمولہ جموں وکشمیر
فون نمبر 7889382310

کشمیر پورے برصغیر میں وہ واحد خطہ ہے جہاں کی سر زمین نے بلاتخصیصِ رنگ ونسل، جنس وملت، متعدد برگزیدہ شخصیات کو جنم دیا ہے۔ یہ خطہ جہاں صوفیوں، سنتوں اور ریشیوں کی آما جگاہ رہا ہے وہیں زندگی کے دیگر شعبہ جات خاص کر علم وادب میں بلند قامت شخصیات کی ایک بڑی کھیپ اُن رنگ برنگے اور مہکتے پھولوں کی مانند اس چمن کو ہمیشہ مزین اور معطر کرنے میں کار فرما رہے ہیں۔ یہاں قد آور شعراء حضرات کے ساتھ ساتھ ایک خاصی تعداد معتبر شاعرات کی بھی سامنے آئی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ جموں وکشمیر کے شعری اُفق پر اُردو شاعرات بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں رونما ہوئیں۔اس سے پہلے خواتین نے اپنے جذبات واحساسات کو مردانہ سماج کی بالادستی اور جابرانہ رویئے کے تحت اندر ہی اندر دبائے رکھا تھا۔اتفاق سے کشمیر کی جو پہلی خاتون شاعرہ 'لل دید' ہیں وہ بیک وقت ایک برگزیدہ مذہبی ہستی بھی تھیں۔لل عارفہ جو ایک پنڈت گھرانے میں پیدا ہوئیں اور پنڈت گھرانے میں ہی بیاہی بھی گئیں، مگر ساس اور سسرال کے مظالم اور زیادتیوں سے عاجز آ کر وہ دنیاوی زندگی کو تج کر نروان کی تلاش میں نکل پڑیں۔اس طرح انہوں نے رہبانیت کے رستے اپنے اور کائنات کے راز کو پالیا۔

لل دید (جنہیں لل ایشوری یا لل عارفہ بھی کہا جاتا ہے) کے یہاں اظہار ذات سے زیادہ اظہارِ کائنات اور موجدِ کائنات کے اظہار کی کئی صورتیں ملتی ہیں۔ان کے واکھوں میں ایک ایسے فلسفہ کا بیان ہے جسے ''فلسفہ شِومت'' کے نام سے موسوم ہے۔گویا کہ کشمیر اور کشمیری شاعری کی پہلی باضابطہ اور مستند آواز ایک عورت کی آواز ہے۔اُن کے بعد ایک اور شاعرہ حبہ خاتون سسرال کی ستائی ایک مظلوم عورت تھی۔مگر حبہ خاتون نے لل دید کی طرح رہبانیت میں پناہ نہیں لی۔وہ اپنے عورت ہونے کے وجود کو نہ صرف تسلیم کرتی ہیں بلکہ عورت کی جنسی و حیاتیاتی احتجاج کا بھی اظہار کرتی ہیں اور پدری نظام و تصور رکھنے والے زمانے کو پہلی بار ایک عورت کے جذبات و خیالات اور نسائی لب و لہجے سے متعارف کراتی ہیں۔لل دید اور حبہ خاتون کے بعد کئی اور شاعرات کشمیر میں پیدا ہوئیں جن میں ارنہ مال، روپ بھوانی، نجتہ دید اور جمعہ بی بی کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ان سب نے اپنی عارفانہ شاعری کے ذریعے مرد کے ظلم و ستم اور عورت کی بے بسی کی نشاندہی کردی تھی۔اس سلسلے میں ورجینا وولف کہتی ہیں: ''عورتوں کا ادب ہر حال میں تانیثی ہی ہوگا۔ اگر وہ عمدہ ہوگا تو وہ عمدہ تانیثی ادب کہلائے گا''۔ (Women & Fiction by Virginia woolf)

پورے برصغیر میں کشمیر واحد جگہ ہے جہاں کے لوگوں نے اپنی مادری زبان 'کشمیری' کے فوراً بعد اُردو کو اپنی دوسری مادری زبان کا درجہ دیا ہے۔یعنی جتنی محبت لوگ کشمیری زبان سے کرتے ہیں، اسی قدر وہ اُردو کے ساتھ اپنی وابستگی بھی محسوس کرتے ہیں۔۱۸۸۹ء میں کشمیر میں جب اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ مل جاتا ہے تو یہاں کے پڑھے لکھے لوگ جو اس سے پہلے کشمیری زبان میں یا پھر فارسی زبان میں شعر و ادب تخلیق کرتے تھے۔انہوں نے اُردو زبان کی طرف توجہ دینا شروع کیا۔اس طرح جموں و کشمیر میں اُردو شعر و ادب کا آغاز ہوتا ہے۔مگر بہر حال اُردو زبان جب اس خطے میں داخل ہوئی تو اُردو شعر و ادب کے ہمراہ وہ اپنی تہذیب اور کلچر بھی لائی تھی۔جس کلچر میں 'عورت' کی آواز اپنی صنفی و شخصی حیثیت کی ہمیشہ نفی کر کے تذکیریت کے غلبے کی ہی شکار

رہی تھی۔

ریاستی سطح پر ادب بالخصوص شعری منظر نامے میں خواتین کی عدم موجودگی کی کئی وجوہات رہی ہیں جن کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے، اور ان وجوہات میں ایک اہم وجہ یہ تھی کہ ریاستی جموں وکشمیر کے عوام کی فطرت میں عہدِ قدیم سے ہی صوفیوں، سنتوں اور درویشوں سے عقیدت اور مذہبی جوش وجذبے کا عنصر کافی حد تک موجود رہا ہے جس کے زیرِ اثر 'عورت' کا فنونِ لطیفہ یا ادبی مجالس میں شمولیت کو معیوب اور قابلِ ملامت سمجھا جاتا رہا۔ زمانہ کبھی بھی یکساں نہیں رہتا۔ زمانے کے بدلتے و متغیر حالات نے خطۂ جموں وکشمیر کی شاعرات کو بھی اپنی موجودگی کے احساس سے دوچار ہونے اور اپنے وجود کی ان نازک اساسی حقیقتوں کے اثبات کے مواقع فراہم کئے۔ چنانچہ یہاں کی خواتین شاعرات نے جب ان مواقع سے بھرپور فائدے اٹھانے کی ٹھان لی تو ان کی آوازیں گزشتہ اوقات کی طرح در و بام سے ٹکرا کے پلٹ کر نہ آئیں بلکہ اب کے ان کی گونج کشمیر کی وادیوں میں بھی سنائی دیں اور بازگشت وادی سے باہر مختلف شعری حلقوں تک بھی پہنچ گئی۔

جموں وکشمیر میں جن خواتین نے اُردو شعر وادب میں نہ صرف ریاستی بلکہ ملکی سطح پر اپنا مقام اور پہچان قائم کی ہے اُن میں عائشہ مستور، ترنم ریاض، صاحبہ شہریار، پروین راجہ، نصرت آرا چودھری، سیدہ نسرین نقاش، شبنم عشائی اور رُخسانہ جبین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ پروین راجہ، نرگس ستارہ اور نگہت فاروق نظر بھی شعر کہتی ہیں۔ یہ ایسی معتبر خواتین ہیں جنہوں نے اُردو شاعری کی روایتی اقدار کا خیال رکھتے ہوئے جدید تر رُجحانات کا بھی خیر مقدم کیا ہے۔ سب سے بڑی اور مستحسن بات یہ کہ ان خواتین نے نسوانی مسائل اور نفسیات کو اپنی شاعری کا جامہ پہنایا ہے۔ آزاد نظم ان متذکرہ خواتین کے نزدیک ایک ایسی پسندیدہ صنف رہی ہے جس کے تحت وہ اپنے رنج والم، احساسات وجذبات، تجربات ومشاہدات کے علاوہ مردانہ سماج میں عورت کی حیثیت واہمیت اور اس پر ہو رہے ظلم واستحصال کا برملا اظہار کر رہی ہیں۔

☆**رخسانہ جبین:** جموں وکشمیر میں اُردو شاعرات کے حوالے سے رُخسانہ جبین ایک اہم نام ہے۔ وہ یکم مئی ۱۹۵۵ء میں سرینگر (کشمیر) میں پیدا ہوئیں۔اُن کی تعلیمی قابلیت ایم.اے،ایم.فل ہے۔ وہ اُردو شعروادب سے خاصہ لگاؤ رکھتی ہیں۔رخسانہ جبیں بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں سے بھی زیادہ عرصے سے اُردو ادب کو اپنی شاعری سے مالا مال کر رہی ہیں۔وہ جداگانہ لب ولہجہ کی شاعرہ ہیں اور بہت حد تک ایک متانت آمیز رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔رخسانہ جبیں فطری طور پر غزل کی شاعرہ ہیں۔نیا پن ان کی شاعری کا خاصہ ہے،اور قافیہ بند شاعری ہی میں زیادہ تر اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کرنا مناسب سمجھتی ہیں۔ان کے شعروں میں استعارات،تشبیہات اور تلمیحات کے برمحل استعمال کے ساتھ گہری معنویت محسوس کرتا ہے۔رخسانہ جبیں کے نزدیک غزل ایک نازک اورلطیف ترین صنف سخن ہے جو گائیکی کا تقاضا کرتی ہے۔اُن کی شاعری میں معنوی تہہ داری ایک خاص عنصر ہے۔چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

؎ کوئی سمجھا دے ساحل پر ماتم کرنے والوں کو
اپنی مرضی سے کشتی کو اس گرداب میں ڈالا

؎ دُنیا میں دیکھا ہے ہر سو جھوٹ، کپٹ، چھل، مکر وفریب
اور یہ سننے میں آیا ہے جھوٹے کا منہ کالا ہے

؎ استفہام کے جنگل میں کب،کون،کہاں، کیوں، کیسا، کیا
سوچ میں خود کو گم پایا ہے جب سے ہوش سنبھالا ہے

رخسانہ جبین نے ان اشعار میں جہاں محبوب کے بھولے پن کی طرف بلیغ اشارے کئے ہیں تو وہیں وہ وقت، حالات اور سماج کی بھیانک صورتِ حال کو ایک خاموش تماشائی کی طرح نہیں دیکھتی بلکہ ایک حساس اور دردمند شاعرہ کی حیثیت سے اپنا ایک اصلاحی نقطۂ نظر بھی واضح کرتی ہیں۔اس کارخانۂ قدرت کو بغور دیکھتی ہیں اور اس میں اپنی ذات کی شناخت، حیثیت اور اپنے مقام و مرتبے کو کھوجنے لگتی ہیں۔نازک خیالات، لطیف جذبات اور احساسات کو شعری

پیکروں میں اس طرح ڈھالنا کہ اُن میں آفاقیت اور صداقت پیدا ہو جائے:

ہمارے خواب عجب کہکشاں بناتے ہیں
زمیں کو تاروں بھرا آسماں بناتے ہیں
میں بھول جاتی ہوں ان کی کہانیاں کتنی
ذرا سی بات کو وہ داستان بناتے ہیں

رخسانہ جبیں عہدِ گزشتہ کی صحت مند روایات اور اپنے اسلاف کی عظمت کا احساس رکھتے ہوئے جب موجودہ بحرانی ماحول میں معاشرے پہ نظر دوڑاتی ہیں تو انہیں گھٹن محسوس ہونے لگتی ہے کہ اُن کے معاشرے میں جہاں سیاست اپنا سنگدلانہ کھیل، کھیل رہی ہے تو وہیں اور کئی طرح کی ناخوشگواریاں اُن کا خیر مقدم کرتی ہیں۔ جب ان کے جذبات شدت اختیار کر لیتے ہیں تو وہ اپنے جذباتی ردِعمل کو اس طرح کے اشعار میں ظاہر کرنے لگتی ہیں:

احباب سناتے ہیں کوئی اور کہانی
ہیں میرے حریفوں کے بیاں اور طرح کے
اجداد وراثت میں گھٹن چھوڑ گئے ہیں
تعمیر کریں اب کے مکاں اور طرح کے

ان اشعار سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ رخسانہ جبیں کا شعور کافی بالیدہ ہے۔ اُن کے تفکر میں فلسفیانہ گہرائی ہے اور یہی گہرائی اُنہیں معاصر شاعرات سے منفرد مقام عطا کرتی ہے۔

☆ **عائشہ مستور:** عائشہ مستور بیک وقت کشمیری اور اُردو دونوں زبانوں میں شاعری کرتی ہیں۔ کشمیری میں ان کے دو شعری مجموعے ''پوت نظر'' اور ''باوتھ'' منظر عام پر آئے ہیں اور اُردو میں ''موجِ مضطر'' کے نام سے ان کا شعری مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

☆ **صاحبہ شہریار:** صاحبہ شہریار کا نام بھی شعری حلقوں میں جانا پہچانا ہے۔ ان کے یہاں نسائی حسیت کے ساتھ ساتھ نسوانی زبان Feminine Ericture کو بھرپور انداز میں دیکھا جا سکتا

ہے۔ان کے تین شعری مجموعے ''شاخِ لرزاں''، ''برگِ چنار''، ''آگہی کا در'' منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ان کا سب سے بہترین وصف یہ ہے کہ دھیمے سروں میں نہایت ہی سبک انداز اپنی نسوانیت کا احساس کراتی ہیں۔

☆**ترنم ریاض:** نسائی حسیت کی ایک اور آواز ترنم ریاض کی ہے جو ایک منجھی ہوئی افسانہ نگار، عمدہ ناول نگار اور معتبر شاعرہ کے ساتھ ساتھ محقق و نقاد کی حیثیت سے اپنی لیاقت و قابلیت کا لوہا منوا چکی ہیں۔ترنم ریاض ۹/اگست ۱۹۶۳ء کو سرینگر کشمیر کے ایک علمی اور ادبی گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ چودھری محمد اختر خان کی یہ صاحبزادی اُردو شعر و ادب کی رسیا ہیں۔اُن کی مادری زبان اگرچہ کشمیری ہے مگر وہ اُردو، ہندی اور انگریزی پر بھی عبور رکھتی ہیں۔اُن کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۷۵ء میں ہوا اور اُس دور سے لے کر اب تک مسلسل لکھ رہی ہیں۔ترنم ریاض کی تصانیف اعلیٰ ادبی معیار کی حامل ہیں۔اُن کی جو تصانیف تا حال منظر عام پر آ چکی ہیں اُن میں ''پرانی کتابوں کی خوشبو''، (شعری مجموعہ) ''یہ تنگ زمین'' (افسانے)، ابابیلیں لوٹ آئیں گی'' (کہانیاں)، ''سنو کہانی'' (ہندی)، ''چاند لڑکی'' (نظمیں)، ''نرگس کے پھول'' (ناولٹ)، ''صحرا ہماری آنکھوں میں'' (ناول)، ''قدم قدم نقش'' (کہانیاں)، ''چشمِ نقشِ قدم'' (مضامین) اور ''موتی'' اور ''برف آشنا پرندے'' (ناول) ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی حاصل کر چکی ہیں۔

جہاں تک ترنم ریاض کی شاعری کا تعلق ہے وہ بلاشبہ ایک معتبر اور سنجیدہ دل کی آواز ہے جو زندگی کے مختلف پہلوؤں اور رویوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے جس میں تصنع ہے نہ کوئی اکھراپن بلکہ نسوانی جذبات و احساسات کو جہاں ترنم ریاض نے اپنی غزلوں اور نظموں میں لطافت اور شگفتگی سے پیش کیا ہے وہیں زندگی کی آفاقیت اور اس کی بوقلمونی کو فطری ارتقا کے تناظر مین بھی دیکھتی اور محسوس کرتی ہیں۔اپنے جذبات و مشاہدات اور تلخ تجربات کو تخلیقی طرح دینے میں وہ بڑی بے باک بھی دکھائی دیتی ہیں وہ زندگی کے اُن تمام منفی اور مثبت پہلوؤں کی بھی نشاندہی کرتی چلی جاتی ہیں جو مشیتِ ایزدی یا مصلحتِ خداوندی قرار پائی ہیں۔غزلوں کے مقابلے میں اُن کا تخلیقی

جوہر نظموں میں اور زیادہ کھل کر سامنے آیا ہے۔ اُن کی نظموں میں ''گھر''، ''منظر''، ''بچپن''، ''وجودیت'' یا سمیع الدعا'' قابل ذکر ہیں جن میں وہ بڑے خوبصورت الفاظ میں خوبصورت سپنے سجا لیتی ہیں۔ ترنم ریاض نے جہاں عصری حالات میں پامال ہوتی انسانی اقدار اور سفاکانہ قوتوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا تو وہیں وہ فطری طاقتوں کے آگے انسان کی بے بسی اور اُس کی لاحاصل تمناؤں کا ذکر بھی بڑے متاثر کن انداز مین اس طرح کرتی ہیں کہ یہ ہر شخص کو اپنی زندگی کی یاد میں تڑپانے لگتی ہیں۔

ترنم ریاض کی شاعری میں عورت کی زندگی کے کئی مسائل اور رُخ موجود ہیں۔ وہ عورت کی بھرپور نمائندگی اور وکالت کرتی ہیں۔ انہیں عورت کی عظمت اور خوبیوں کا احساس ہے۔ ان کی نظم ''یا سمیع الدعا'' عورت کی اس بے بسی اور محرومی کا ایک بہترین اظہار یہ ہے کہ جس میں وہ اللہ سے فریادی ہیں۔ اس نظم میں عورت ذات مسلسل درد و کرب سے گزرتی ہوئی دکھائی گئی ہے۔ ترنم ریاض کے یہاں عورت کی شخصیت، پدرانہ سماج میں اس کے تئیں غیر انسانی و ناروا رویوں، عورت کے ردعمل، اپنی حیاتیاتی و ذہنی آزادی کے اظہار، اپنے جذبات و احساسی کوائف کا ہر اعتبار سے ایک مکمل Discourse کو دیکھا جا سکتا ہے۔

ترنم ریاض کی شاعری اضطرابِ زندگی کی شاعری ہے۔ وہ حسن و عشق اور گل و بلبل یا رقص و سرور کی بات نہیں کرتیں بلکہ اضطراب اور آفاقی قدروں کی بات کرتی ہیں۔ جدید فکر و فلسفے کے باعث ہماری معاشرتی زندگی میں جو انتشار و اختلال پیدا ہوا ہے، ترنم کو شدید احساس ہے۔ اُن کی غزلیہ شاعری میں بھی مایوس کن حالات و واقعات کی وقوع پذیری پر اظہارِ تاسف ملتا ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

؎ رُوح سے ٹپکے لہو آنکھ سے پانی برسے
میں نے سوچا ہی نہ تھا جاتے ہیں بچے گھر سے
وہ میری طرح نہ بچوں کے لئے رو دے کہیں

اپنے چہرے پہ سجاتی ہوں ہنسی اس ڈر سے

الغرض یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ خواتین ادیباؤں اور شاعرات میں ترنم ریاض منفرد ہیں جنہوں نے اپنی گراں قدر ادبی خدمات سے اُردو ادب کو مالا مال کیا ہے۔

☆**پروین راجہ:** جموں وکشمیر کی اُردو شاعرات کے سلسلے میں پروین راجہ کا نام بھی نسائی حسیت کے اظہار کی ایک بہترین خوبصورت کڑی ہے۔ان کی غزلوں اور نظموں میں نسائی لب ولہجہ پوری شدومد کے ساتھ جلوہ افروز ہوتا ہے۔یہ نوحہ بھی کرتی ہے اور احتجاج بھی اور طنز کے نشتر بھی بلاخوف چلاتی ہیں:

شہرِ گماں کے لوگ اب مطمئن ہوئے
سرفرازی دیواروں پہ لکھی
شوخ لہجوں میں ابھرا
مبارک مبارک!

☆**شبنم عشائی:** شبنم عشائی کا تعلق بھی کشمیر ہی سے ہے۔وہ تانیثی ادب میں اپنے مخصوص فکرو فلسفے اور اندازِ بیان کے تحت اپنی ایک الگ پہچان بنا چکی ہیں۔شبنم کی شاعری کا کینوس کافی وسیع ہے۔وہ کبھی تو اپنے وجود پر متفکر نظر آتی ہیں تو کبھی روح اور مادے کی بات کرتی ہیں اور کبھی تصوف کے حوالے سے کائنات میں عورت کے وجود پر مختلف طرح کے سوالات اٹھاتی ہیں۔مختلف جہات میں بٹی شبنم عشائی کی شاعری عصری ادب میں خاصی توجہ اور معنویت کی حامل ہے۔

شبنم عشائی ۱۲/اپریل ۱۹۶۲ء کو کشمیر کے ایک قصبے تاپر پٹن میں ایک جاگیر دارانہ گھرانے میں پیدا ہوئیں۔انہوں نے ''بیگانگی کا وجودی نظریہ'' پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔اس وجودی فکر وفلسفے کی گہری چھاپ اُن کی شاعری پر بھی واضح طور پر نظر آتی ہے۔شبنم عشائی کا اولین شعری مجموعہ ''اکیلی'' ۱۹۹۹ء میں منظرِ عام پر آیا جس میں اُن کی نظمیں شامل ہیں۔۲۰۰۰ء میں اُن کی نظموں کا انتخاب ''میں سوچتی ہوں'' شائع ہوا۔۲۰۰۲ء میں

اُن کی اُردو، ہندی رسم الخط میں نظمیں ''من بانی'' کے نام سے شائع ہوئیں اور جنوری ۲۰۰۸ء میں اُن کی نظموں کا ایک اور مجموعہ ''کتھارسس'' کے نام سے شائع ہوا۔

شبنم عشائی کی شاعری واقعی ایک ایسی خاتون کی شاعری ہے جو نسوانی جذات و احساسات، درد، کسک، وارفتگی اور زندگی کے نشیب و فراز کا گہرا شعور اور ادراک رکھتی ہے۔ وہ اپنی صدائے احتجاج کو انسانی معاشرے میں دور اور دیر تک کے لئے برقرار رکھنے کی متمنی ہیں۔ حسن و عشق اور زندگی کی الجھنوں میں کیا کچھ باقی رہتا ہے اور کیا فنا ہو جاتا ہے اس سانحہ کو شبنم نے اپنی نظموں میں بیان کیا ہے۔ وہ ظاہری حسن و جمال کے بدلے داخلی حسن کو کھوجتی ہیں عورت ذات کو اُس کے صدیوں سے چلے آرہے سماجی بندھنوں اور خاندانی روایات کو توڑ کر اُسے آزادانہ طور پر زندگی گزارنے، خود اعتمادی اور خود کفیل زندگی جینے کی تلقین کرتی نظر آتی ہیں۔ اُن کی نظموں کی کئی سرحدیں اور کیفیتیں ہیں۔ کہیں آشفتگی ہے، کہیں آسودگی، کہیں ہجر وصال ہے تو کہیں پورا وجود سراپا آرزو۔ شبنم عشائی کی چند نظمیں ''آدھی رات''۔

شبنم عشائی کی ان نظموں میں عشق کی حرارت، دل کی بے قراری اور محبوب سے وصال کے لطیف لمحاتی کیفیات میں پورے وجود کا نکھر نکھر جانے اور فریقین کا ٹوٹ کر چاہے جانے کی آرزو موجود ہے۔ لیکن زندگی کے غیر یقینی سفر میں یہ پُر مسرت لمحے زیادہ دیر قائم نہیں رہتے اور دھیرے دھیرے جذبۂ عشق و محبت کا اقرار نامہ مکر و فریب، منافقت اور شکستگی میں مبدل ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ شبنم عشائی اپنے شکوہ آمیز لہجے میں کہیں تو مرد معاشرے کے نقائص بیان کرتی ہیں تو کہیں عورت کو شعور و آگہی کا درس دیتی نظر آتی ہے۔

☆ **نصرت آرا چودھری:** ڈاکٹر نصرت آرا چودھری کشمیر میں پیدا ہوئیں، وہیں پلی بڑھیں اور علمی و ادبی سفر کا آغاز بھی وہیں سے ہوا۔ مگر اب وہ ایک طویل عرصے سے جموں میں رہائش پذیر ہیں۔ انہوں نے کشمیر یونیورسٹی سے ایم۔اے اُردو کا امتحان ۱۹۸۱ء میں اول درجہ میں پاس کرنے کے بعد اسی یونیورسٹی سے ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اُن کا سب سے اہم

ادبی کارنامہ 'فیض کی شخصیت اور شاعری' پر لکھا ہوا وہ تحقیقی مقالہ ہے جو انہوں نے پی۔ایچ۔ڈی کے لئے لکھا ہے۔نصرت کی جو تصانیف اس وقت تک زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آ چکی ہیں اُن میں ''فیض کی شاعری: ایک مطالعہ''، ''فیض احمد فیض اور جدید شعری ذہن''، ''نبضِ افسانہ'' اور اُن کی خوبصورت غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ''ہتھیلی کا چاند'' اہم ہیں۔ان تصانیف کے علاوہ اُن کی دو اور تصانیفِ ''اُردو تنقید میں فیض شناسی'' اور ''صوبہ جموں میں اُردو افسانے کا منظر نامہ'' زیرِ اشاعت ہیں۔

''ہتھیلی کا چاند'' نصرت آرا چودھری کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ کا مجموعہ ہے جو ۲۰۰۴ء میں انٹرنیشنل پبلی کیشنز دہلی نے بڑی دیدہ زیب صورت میں چھاپا ہے۔زیرِ نظر مجموعہ میں غزلیں اور آزاد نظمیں شامل ہیں جن کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ نصرت آرا کی زندگی کا بیشتر حصہ رنج والم اور یاس وحسرت میں گزرا ہے۔اُن کی تمام غزلیں اور نظمیں اس بات کی غماز ہیں کہ کوئی صدمہ اُن کے ذہن و دل پہ کچوکے لگا رہا ہے۔دُنیا کی ناپائیداری، جھوٹی محبت، عورت ذات کا استحصال، اُس کی بے بسی، سسکیاں اور آہیں ایسے تلخ موضوعات ہیں جنہیں نصرت چودھری نے اپنی غزلوں اور نظموں میں برتا ہے۔وہ انسانی نفسیات تک پہنچنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہیں۔اس کے لئے وہ نہ تو دقیق الفاظ استعمال کرتی ہیں اور نہ ہی مبہم تشبیہات، استعارت اور ترکیب بلکہ راست بیانیہ انداز کے تحت اپنا مافی الضمیر کا اظہار کرتی ہیں۔اُن کی بہت سی غزلیں مختصر بحر میں ہیں جن میں سوز و گداز، درد و کرب اور زبان کی چاشنی گھلی ہوئی ہے۔حالاتِ حاضرہ پر نصرت چودھری کی نظر کافی گہری ہے۔وہ جانتی ہیں کہ آئے دن اس روئے زمین پہ انسان کا خون بڑی بے دردی سے بہایا جا رہا ہے۔وہ ان مایوس کن حادثات و واقعات کو دیکھ کر دیکھ کر تڑپ اُٹھتی ہیں۔اُن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتی ہیں:

جو بھی چہرے ہیں خون سے تر ہیں
ہر طرف غم زدہ سے پیکر ہیں

روزِ محشر سے کیا ڈراتے ہو
میرے آنگن میں سارے محشر ہیں

نصرت آرا چودھری اپنے اشعار میں نسوانی جذبات و احساسات کو باریک بینی اور لطافت سے پیش کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔ اُن کے نزدیک عورت ہر حال میں قیدی ہے جو پوری زندگی ایک قید خانے سے دوسرے قید خانے میں منتقل ہوتی رہتی ہے اور اس طرح اُس کی زندگی میں اندھیرے ہی اُس کے سچے ساتھی بن جاتے ہیں۔ مثلاً

؎ میں ہوں تنہا تم پاس آؤ ، آؤ اندھیرو آؤ
میرے شریکِ غم ہو جاؤ ، آؤ اندھیرو آؤ
؎ پہلے بھی تم ساتھ میرے تھے اب بھی ہو تم ساتھ
آخر تک یہ ساتھ نبھاؤ، آؤ اندھیرو آؤ

نصرت چودھری کی نظموں میں بھی ایک تنوع اور پُرکشش انداز موجود ہے۔ ''ہتھیلی کا چاند''، ''زندگی''، ''خودفریبی''، ''وفا''، ''سِل''، ''آرزو''، ''سفر آئینہ کا''، ''قیدی لمحے''، ''یاد کا چاند''، ''چپ کے مکانوں کے قیدی''، ''خالی کلائی'' ایسی جاندار نظمیں ہیں جو انسانی زندگی اور اس کی نفسیات کے کئی گوشوں کو آشکار کرتی ہیں۔

☆ **سیدہ نسرین نقاش:** سیدہ نسرین نقاش ریاست جموں وکشمیر کی ایک اہم شاعرہ ہیں۔ وہ نوا کدل سرینگر میں پیدا ہوئیں۔ ایم.اے پولیٹکل سائنس اور ایم.اے صحافت (جرنلزم) کی اسناد حاصل کرنے کے بعد وہ مکمل طور پر اُردو شعر و ادب کی خدمت میں لگ گئیں۔ ان کے شاعری کے چار مجموعے ''لہو پکارتا ہے''، ''دشتِ تنہائی'' اور ''روحیں چناب کی''، ''دشت گماں'' منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کے علاوہ ''ادھوری خواہش'' (افسانوی مجموعہ)، ''تنقید و تحقیق تک'' اور ''کشمیر ۱۹۴۷ء سے لے کر اب تک'' شامل ہے۔ وہ ایک رسالہ ''صدا'' (سہ ماہی) شائع کرواتی ہیں۔

سیدہ نسرین غزلیں، نظمیں، گیت، دوہے۔ آزاد نظمیں، معریٰ نظمیں اور قطعات کے

علاوہ ماہیا بھی خوب لکھتی ہیں ۔''ماہیا'' شاعری کی وہ صنف ہے جس میں عورت کے جذبات کا اظہار عورت ہی کی زبان سے کیا جاتا ہے۔ وہ عورت کے وجود، حسن کی رعنائی ،شعلہ عشق کا نظارہ اور دردِ تنہائی کو اس طرح محسوس کرتی ہیں:

؎ میں اُس کو جانے سے روکوں تو کس طرح روکوں؟
میں سوچتی ہی رہی اور وہ چلا بھی گیا

؎ تیری یادوں نے خیالوں کو معطر کر دیا
اور تارِ اشکِ پیہم سلکِ گوہر کر دیا

نسرین کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے کہ جس میں وہ اپنے احساسات کو ایک منفرد انداز میں بیان کرتی ہیں:

؎ کوئی آئے گا نہ مجھ سا بخدا میرے بعد
ختم ہو جائے گا دستورِ وفا میرے بعد

؎ وہ تو بس میں ہوں کہ قاتل کو دُعا دیتی ہوں
ورنہ کیوں ہوگا کوئی حرفِ دُعا میرے بعد

انتخاب اور بھی غزلوں کے چھپیں گے نسرینؔ
ہوں گے بے معنی و بے حرف و نوا میرے بعد

الغرض یہ کہ نسرین نقاش کے کلام کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ وہ بحیثیت ایک عورت قاری کی ملاقات ایک ایسی عورت سے کرواتی ہیں جو زندہ اور افعال ہے جس میں نسوانیت، شوخی، ناز و ادا ،دلکشی اور ورافتگی موجود ہے۔ سیدہ نسرین نقاش ایک جہاں دیدہ، انتہائی بے باک اور وسیع فکر و نظر کی خاتون ہیں۔ انہیں مینا کماری ایواڑ، ساحر لدھیانوی ایواڑ، میر تقی میر ایواڑ اور دُختر کشمیر جیسے اعزازات سے نوازا گیا ہے۔

☆**سیدہ نکہت فاروق نظرؔ:** سیدہ نکہت نظرؔ ۱۹/جولائی ۱۹۶۴ء کو لال بازار سرینگر کشمیر میں پیدا

ہوئیں۔ان کے پہلے افسانوی مجموعہ ''قہر نیلے آسماں کا'' میں کل پندرہ افسانے شامل ہیں۔''قہر نیلے آسماں کا''، ''عرشی''، '' کچھ خواہشیں مرتی نہیں''، ''شفق رنگ شباب''، ''درد بیتے لمحوں''، ''سراب''اور''ویران''ایسے مختصر مختصر افسانے ہیں جن میں کہیں نہ کہیں عورت کا دُکھ درد، اُس کے ساتھ مرد کی ظالمانہ روش، استحصال، بے بسی اور اُس کے تڑپتے سسکتے ارمانوں اور خوابوں کو افسانوی رنگ وآہنگ میں پیش کیا گیا ہے۔وادی میں بسنے والے لوگوں کے مصائب اور اُن کے دردوکرب کو نکہت نے محسوس کیا ہے۔

نکہت نظر کی آواز میں ارتعاش بھی شامل ہے اور احتجاج بھی، جو سماج کے اس پدری نظامِ تصور پر کاری ضرب لگاتی ہیں جس نے عورت کو Second Sex یعنی دوسرے درجے کے شہری سمجھ کر اس کے وجود کو استحصال کا مرکز بنا کے رکھ دیا ہے۔مزید برآں سیدہ نکہت نظر نے ان افسانوں میں خاص طور پر اُس مصیبت زدہ اور شکست خوردہ عورت کے احساسات و جذبات کی تصویر کشی کی ہے جو جموں وکشمیر کے بحرانی حالات و واقعات کی شکار رہی ہے۔یہ غم زدہ عورتیں حالات اور وقت کی ستائی ہوئی ہیں۔یہ اپنا ضمیر بیچنا نہیں چاہتی ہیں بلکہ باعزت اور خوددار بن کر سفرِ حیات طے کرنا چاہتی ہیں۔

☆ **زنفر کھوکھر:** ریاست جموں وکشمیر میں خواتین اُردو افسانہ نگاروں میں ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔زنفر کھوکھر کا تعلق ریاست جموں وکشمیر کے ایک پسماندہ علاقہ راجوری سے ہے۔راجوری صوبۂ جموں کا ایک ضلع ہے۔فطری مناظر سے آراستہ یہ علاقہ علمی وادبی لحاظ سے رزخیز ہے۔زنفر کھوکھر کا پہلا افسانوی مجموعہ ''خوابوں کے اُس پار'' ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا جسے ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی حاصل ہوئی۔زنفر کھوکھر کا دوسرا مجموعہ ''کانچ کی سلاخ'' کے نام سے ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا۔اس افسانوی مجموعے میں زنفر کے ایسے افسانے شامل ہیں جن میں عصرِ حاضر کے انسان کی ذہنی پراگندگی، سماج ومعاشرے میں چل رہے انتشار اور خاص کر عورت کی سرد مہری، اُس کے ٹوٹنے بکھرنے کی کتھا، سسکتے ارمانوں اور نفسیاتی کشمکش اور گھٹن کا حال، بے رحم لوگ، رسم و

رواج کے پابند عوام، تعلیم کی اہمیت سے نابلد ذہن اور عورت کی خوشحال زندگی کا خواب جیسے موضوعات ہیں۔ وہ ایک حقیقت پسند ادیبہ کی حیثیت سے اپنے گردوپیش میں رونما ہونے والے حالات وواقعات کو اپنے افسانوں میں اس طرح پیش کرتی ہیں کہ قاری کے سامنے ایک ایسا انسانی معاشرہ اُبھر کر آتا ہے جہاں طبقاتی اور نفسیاتی کشمکش کے علاوہ سیاسی اور اقتصادی بحران موجود ہے۔ عورت ہونے کے ناطے صنفِ نازک کی نفسیات اور اُس کی داخلی کیفیات کو زنفر نے بڑی باریک بینی سے سمجھا اور اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔

☆ **نیلوفر ناز نحوی:** نیلوفر ناز نحوی کے شائع شدہ دو افسانوی مجموعے ''چنار کے برفیلے سائے'' (۲۰۱۳ء) اور ''خاموش آسمان'' (۲۰۱۵ء) ہیں۔ ''چنار کے برفیلے سائے'' میں ۲۴ مختصر افسانے اور ۵ افسانچے شامل ہیں۔ جبکہ ''خاموش آسمان'' میں ۲۳ مختصر افسانے قاری کو دعوتِ مطالعہ دیتے ہیں۔ نیلوفر فارسی زبان پی دسترس رکھتی ہیں۔ فارسی کی تدریسی ان کے فرائضِ منصبی میں شامل ہے اور اردو سے بہت مانوں ہیں جس کا عملی ثبوت ان کے مذکورہ افسانوی مجموعے ہیں۔ طویل قصے کہانیاں لکھنے سے وہ احتراز کرتی ہیں۔ انہیں دراصل اس بات کا احساس ہے کہ اکیسویں صدی کا انسان جو سائنسی اور تکنیکی ترقی کی یلغار میں ایک طرح کے شورش زدہ ماحول میں زندگی کی نیرنگیوں میں مصروف ہے اسے ذہنی آسودگی اور تازگی فراہم کرنے کے لئے مختصر نویسی ایک موثر ذریعہ ہے۔ نیلوفر ناز کی بہت سی چھوٹی چھوٹی کہانیوں میں کشمیر کے پُرآشوب دور کا بیانیہ قاری کو متحیر کر دیتا ہے۔

مجموعی اعتبار سے جموں وکشمیر کی اُردو شاعرات کے یہاں نسائی حسیت ولب و لہجے واضح ہے، اگرچہ اُردو شاعری میں یہاں کی خواتین کی تعداد اکائیوں میں ہے مگر یہ قلیل تعداد اپنے کلام اور مقام کے لحاظ سے کافی ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں کی شاعرات نے ذرائعِ ابلاغ سے مستفید ہو کر بدلتے عالمی منظر نامے کو مدِنظر رکھتے ہوئے اپنے مسائل، ماحول و معاشرے کے ساتھ ساتھ نسوانی جذبات واحساسات اور بالخصوص موجودہ انتشار زدہ سماج میں عورت کے درد و کرب، احساسِ محرومی، خوف و دہشت، انسان اور انسانی اقدار کی بے حرمتی کو متاثر کُن شعری

آہنگ میں ڈھالا ہے۔ اتنا ہی نہیں وہ اپنے مکمل حقوق کی بحالی اور مرد اساس سماج کے جابرانہ حصار کو توڑ کر کھلی فضا میں سانس لینا چاہتی ہیں۔ اس ذاتی حریت کے لئے وہ مرد کی نفسیاتی کمزوریوں اور اُس کے خود ساختہ شکنجے کی شدید مذمت کرتی نظر آتی ہیں۔ ان معروضات کے بعد یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آج اُردو کے ادبی منظر نامے پر خواتین ادیبوں کی کارکردگی بہت نمایاں ہے اور صحیح معنوں میں خواتین آج اُردو شعر و ادب کے نصف بہتر ہونے کا ثبوت فراہم کر رہی ہیں۔

☆☆☆

مرزا اسد اللہ خاں غالب

سب کہاں، کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہوگئیں

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہوگئیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزن دیوار زنداں ہوگئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنان مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محو ماہ کنعاں ہوگئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہوگئیں

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرت حق سے یہی، حوریں اگر واں ہوگئیں

نیند اس کی دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستان کھل گیا
بلبلیں سن کر میرے نالے غزل خواں ہوگئیں

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہوگئیں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

مرزا اسد اللہ خاں غالب

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا، اگر استوار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو، یہ اگر شرار ہوتا

غم اگر جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا، غم روزگا رہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شب غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

اسے کون دیکھ سکتا، کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائل تصوف، یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ذوقؔ

کسی بے کس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا
جو آپ ہی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا

نہ مارا آپ کو جو خاک ہوا اکسیر بن جاتا
اگر پارے کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا

برے موذی کو مارا نفس امارہ کو گر مارا
نہنگ و اژدہا و شیر نر مارا تو کیا مارا

خطا تو دل کی تھی قابل بہت سی مار کھانے کی
تری زلفوں نے مشکیں باندھ کر مارا تو کیا مارا

نہیں وہ قول کا سچا ہمیشہ قول دے دے کر
جو اس نے ہاتھ میرے ہاتھ پر مارا تو کیا مارا

تفنگ و تیر تو ظاہر نہ تھا کچھ پاس قاتل کے
الٰہی اسنے دل کو تاک کر مارا تو کیا مارا

ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثل قلقل مینا
کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا

مرے آنسو ہمیشہ ہیں برنگ لعل غرق خوں
جو غوطہ آب میں تو نے گہر مارا تو کیا مارا

جگر دل دونوں پہلو میں ہیں زخمی اس نے کیا جانے
ادھر مارا تو کیا مارا، ادھر مارا تو کیا مارا

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے میں
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

دل سنگین خسرو پر بھی ضرب اے کوہ کن پہنچی
اگر تیشہ سر کہسار پر مارا تو کیا مارا

دل بد خواہ میں تھا مارنا یا چشم بد بیں میں
فلک پر ذوقؔ تیر آہ گر مارا تو کیا مارا

نواب مرزا خاں داغؔ دہلوی

جلوہ تیری رعنائی کا کیا کلیجہ ہے تماشائی کا
رہ گیا عرش سے آگے جا کر ہائے عالم مری تنہائی کا
یوں نہ ہو برق تجلی بے تاب مل گیا رنگ تماشائی کا
یاد آتا ہے وہ رسوا کرکے رنج کرنا مری رسوائی کا
آئی شوخی میں کہاں سے تمکین پڑ گیا صبر تمنائی کا
اے لب یار جلا دے دل کو واسطہ اپنی مسیحائی کا
روز دیدار خدا خیر کرے معرکہ ہے تری زیبائی کا
اب تصور سے بھی گھبراتا ہوں کیا مزہ ہے مجھے تنہائی کا
منھ سے بولا تو کہا آئینہ کھیل کھیلے تو خود آرائی کا
ضعف نے دل کو تڑپنے نہ دیا ہوگیا نام شکیبائی کا
ان کی شہرت ہی مٹی جاتی ہے کیا ٹھکانہ مری رسوائی کا
کیا تصور بھی نہ آنے دی گی منھ تو دیکھو شب تنہائی کا

داغ کی قبر مٹا کر بولے
یہ نشاں تھا اسی سودائی کا

مومنؔ

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا رنج راحت فزا نہیں ہوتا
بے وفا کہنے کی شکایت ہے تو بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا
ذکر اغیار سے ہوا معلوم حرف ناصح برا نہیں ہوتا
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
اس نے کیا جانے کیا کیا لے کر دل کسی کام کا نہیں ہوتا
امتحاں کیجئے مرا جب تک شوق زور آزما نہیں ہوتا
ایک دشمن کہ چرخ ہے نہ رہے تجھ سے یہ اے دعا نہیں ہوتا
نارسائی سے دم رکے تو رکے میں کسی سے خفا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے تو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
حال دل یار کو لکھوں کیوں کر ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا
رحم کر خصم جان غیر نہ ہو سب کا دل ایک سا نہیں ہوتا
دامن اس کا جو ہے دراز تو ہو دست عاشق رسا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

کیوں سنے عرض مضطر اے مومنؔ
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

(Quarterly) ISSN : 2582-1229

TAREEKH E ADAB E URDU

International Peer Reviewed Refereed Journal

Vol. No. 2 October-December 2020 Issue No. 4

Editor : Dr. Md. Yahya

Published & Printed by Dr. Md Yahya, On The Behalf Of Dr. Md Yahya
2496/2, Punjabi Basti, Subzi Mandi, Ghanta Ghar, Delhi - 110007, Printed at
J.k. Offset Printing Press, 315 Gali Garahya, Jama Masjid, Delhi - 110006, Editor - Dr. Md Yahya

Price : 200/-